[illegible]

جلد ۵۹ ، عدد ۱ — اکتوبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

[illegible] — [illegible]

نشری تقریریں

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ مولانا مودودی کی اُن غیر مطبوعہ تقاریر کا مجموعہ ہے جو انھوں نے تقسیم سے قبل اور بعد آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی تھیں۔ اِن تقاریر میں مختصر مگر جامع اور دلنشین انداز میں اہم موضوعات پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ درحقیقت گوزہ میں دریا بند ہے۔ پہلی بار کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہیں۔

خوبصورت سرورق ــــ عمدہ کتابت ــــ نفیس طباعت

آپ کی لائبریری کی زینت بننے کے قابل

ضخامت ۱۲۸ صفحات • قیمت مجلد ۲/- روپے، سستا ایڈیشن ۱/۵۰

اپنا آرڈر جلد بک کرائیے مبادا یہ ایڈیشن جلد ختم ہو جائے اور آپ کو دوسرے ایڈیشن کا طویل انتظار کرنا پڑے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۱ سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۹	اکتوبر ۱۹۶۲ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

تاریخ کے لاتعداد روح فرسا واقعات میں ایک عظیم حادثہ یہ ہے کہ انسان نے ماضی کے حالات و واقعات کو پوری طرح جاننے کے باوجود اُن سے بہت کم عبرت حاصل کی ہے۔ اُس کے قدم پلٹ کر انہیں راستوں پر اٹھتے ہیں جن کی تباہ کاریوں سے وہ بخوبی آشنا ہوتا ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر خطرات کے نشانات اُسے مسلسل متنبہ کرتے رہتے ہیں لیکن انسان ہے کہ وہ پھر پھر کر انہی خطرناک راہوں پر گامزن ہونے کی کوشش کرتا ہے جن کے سروں پر عمیق غاریں ہیں اور جن میں دنیا کی بیشمار قومیں گر کر نیست و نابود ہوئی ہیں۔ ایک مفکر نے انسان کی اسی فطرت کا ذکر کرتے ہوئے کہا "میں نے مطالعۂ تاریخ سے جو چیز اخذ کی ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔"

یہ بات یُوں تو ہر فرد اور ہر قوم کے معاملے میں صحیح ہے اور اس کی صحت پر وہ سارے لوگ شاہد ہیں جنہوں نے کبھی بھی تاریخ پر ایک گہری نگاہ ڈالی ہے۔ لیکن اگر آپ اقتدار کی داستان کا مطالعہ کریں تو آپ اسے حرف بحرف صحیح پائیں گے۔ وہ اقتدار جو غیر مسئول ہو اور جس کے دل میں خوفِ خدا نہ ہو وہ بار بار اسی حادثہ کا شکار ہوتا ہے لیکن اُس کی آنکھیں نہیں کھُلتیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ جو اقتدار مسئولیت کے احساس سے بے پروا ہو وہ عنانِ اختیار سنبھالتے ہی جلد بدمست ہو جاتا ہے اور پھر اس مستی کے عالم میں وہ اندھا بہرا ہو کر جس طرف چاہتا ہے چل نکلتا ہے اور کبھی اس بات کو سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ وہ جس راہ پر بے لگام ہو کر بھاگا جا رہا ہے اُسی راہ پر اس کی تباہی اور بربادی کے لیے ڈائنامیٹ بچھے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اُس کے بہت سے پیشروؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ غیر مسئول اقتدار واقعی ایک نشہ ہے، ایک جنون ہے جس کے زیر اثر آ کر انسان کے اندر غور و فکر کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور وہ ایسی

حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جن پر عقل ماتم کرتی ہے۔

آپ اس حقیقت کو صرف ایک مثال کی روشنی میں دیکھیں۔ انسان نے بار بار کئی قسم کے تلخ تجربات کے بعد اس بات کو جانا ہے کہ ذی عقل انسانوں پر حکومت کرنے کے اصول گلہ بانی سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ انسان کو جب تک کسی بات پر اطمینان نصیب نہیں ہو جاتا وہ کبھی بھی اُسے خوش دلی سے قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتا۔ اگر کسی نظریہ کو اُس پر بالجبر ٹھونسا گیا یا قوت اور طاقت کے بل بوتے پر اُس سے کوئی بات منوانے کی کوشش کی گئی تو یہ طرزِ عمل نتائج کے اعتبار سے ہمیشہ مضرت رساں ثابت ہوا۔ اُس شخص یا گروہ نے وقتی مصلحت کی بنا پر کچھ دیر کے لیے تو خاموشی اختیار کرلی لیکن اُس کے سینے میں اس نظریے کے خلاف ہمیشہ نفرت اور حقارت کی آگ سلگتی رہی اور وہ برابر اس موقع کی تلاش میں رہا کہ کسی طرح اس سے نجات حاصل کی جائے۔ چنانچہ اسے شکست دینے کے لیے جو سازش بھی ہوئی وہ اس میں غم و غصہ کے شدید جذبات لیکر شریک ہوا۔ اُس کے دل میں یہ چھپا ہوا احساس پرورش پاتا رہا کہ یہ وہ نظریہ ہے جسے مجھ پر مسلط کرنے کے لیے میری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

یہ احساس جب ایک مرتبہ ذہن میں بیٹھ جاتا ہے تو انسان کا ذہنی توازن کبھی بھی برقرار نہیں رہتا۔ پھر انسان اُس شخص یا گروہ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اس کی ہر بات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ اگر کوئی قدم اس کی خیر خواہی کے لیے بھی اٹھاتا ہے تو اس کا دل اُس پر بھی کبھی مطمئن نہ ہوتا۔ کیونکہ جس شخص یا گروہ کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی فرد یا طبقہ کی بے کسی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا عادی ہے اُس کے متعلق دل میں کبھی کوئی جذبۂ سپاس گزاری پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہر فعل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

انسان کا یہ طرزِ عمل اُس کی فطرت کا خاصہ ہے اور قدرت نے اس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ دیکھیے خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو نظامِ زندگی عطا کیا ہے اُس کی پوری حکمتیں سمجھائی ہیں۔ اگر توحید کی وضاحت

کی گئی ہے تو اس معاملہ میں دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ شرک انسان کے لیے سب سے بڑا ظلم ہے۔ توحید رسالت، قیامت، اور اسی قسم کے بہت سے ایسے اساسی مسائل جن کی حیثیت ایمانیات کی سی ہے انہیں لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھانے کے لیے غور و فکر کا فطری طریق ہی اختیار کیا گیا ہے۔ پھر ایمانیات سے گزر کر جہاں اوامر و نواہی کا تذکرہ ملتا ہے وہاں بھی ہر ایک کی لِم بتائی گئی ہے تاکہ انسان کے دل و دماغ میں کوئی اضطراب اور خلش باقی نہ رہے۔ سزا کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ جب کسی شخص کی فطرت اتنی مسخ اور اس کی عقل اتنی ماؤف ہو چکی ہو کہ وہ حق و صداقت کو محض چڑ اور ضد کی بنا پر سننے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر اُسے عذابِ الٰہی کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ حکیم کا انداز ترغیب الگ اور اُس کا معیارِ حکمت جداگانہ ہے لیکن انسان کے قلب و دماغ سے شک کے کانٹے نکالنے میں اُس نے وہ ساری تدابیر اختیار کی ہیں جو کسی باشعور اور صاحبِ دل انسان کے بس کی ہو سکتی ہیں۔

انسانوں میں بھی وہ اصحابِ اقتدار جنہوں نے انسانی نفسیات کے اس اہم پہلو کو سامنے رکھ کر عوام سے معاملہ کیا ہے وہ کامیاب رہے ہیں اور تاریخ میں اُن کا شمار ظالموں کی صف میں نہیں بلکہ خادمانِ انسانیت کی صف میں ہوتا ہے۔ وہ جس نظریہ کو صحیح اور درست سمجھتے تھے اور اسے دنیا میں غالب دیکھنے کے متمنی تھے۔ اُس کے لیے انہوں نے سب سے پہلے لوگوں کے قلب و دماغ کو قبولیت کے لیے آمادہ کیا۔ بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ اُس کی خوبیاں عوام کے ذہن نشین کرائیں اور بڑی دانشمندی کے ساتھ یہ بتایا کہ اسے قبول کر لینے کے بعد انہیں فلاں فلاں فوائد حاصل ہونگے اور رد کرنے کی صورت میں انہیں اس نوعیت کے نقصانات برداشت کرنے پڑیں گے۔ اُن کی قوتوں اور صلاحیتوں اور اُن کے ذرائع و وسائل کا معتد بہ حصہ دل و دماغ کو تبدیل کرنے میں صرف ہوا اور اس کے بعد کہیں جا کر اُس نظریہ کے تسلط کا اعلان کیا گیا۔ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران گروہ کو اپنے عزائم بروئے کار لانے کے لیے بہت کم مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اذہان پہلے ہی کسی چیز کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو چکے ہوں اور دل پہلے اُس کی افادیت اور صداقت کو تسلیم کر چکے ہوں تو پھر اُس چیز کی بالادستی کا اقرار کرنے میں کوئی دقت

محسوس نہیں ہوتی بلکہ ان حالات میں آدمی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے بیقرار رہتا ہے اور وہ جب تک اس میں کامیاب نہیں ہوتا اس کی بیتابی ختم نہیں ہونے پاتی۔

جو لوگ اس گروہ سے نسبتاً زیادہ جلد باز، جذباتی اور جوشیلے واقع ہوئے انہوں نے اس سے قدرے مختلف طرزِ عمل اختیار کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے قوت کے زور سے اپنے دل پسند افکار و نظریات کو عوام پر مسلط کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں اور جب اس مہم میں وہ خاصے کامیاب ہو گئے تو پھر نشر و اشاعت کے ذریعے ان کے روشن اور تابناک پہلوؤں سے عوام کو آشنا کیا تاکہ اُن کے دل میں ان کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہو اور وہ ان کی افادیت اور سودمندی کے قائل ہو جائیں۔ یہ جذباتی گروہ بھی اس واضح حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کر سکا کہ جن تصورات کے بارے میں عوام کے دل و دماغ مطمئن نہ ہوں اور جنہیں ان کے شعور نے پوری طرح اپنا نہ لیا ہو اُن کی دیر تک بالادستی قائم نہیں رکھی جا سکتی۔ دل کی دنیا ایک ایسا گوشہ ہے جس پر آج تک جبر کی کبھی بھی حکمرانی قائم نہیں ہو سکی۔ یہ محدود سلطنت بڑے بڑے جبّاروں اور قہاروں کی قہرمانیوں میں بھی آزاد رہی ہے۔ یہاں صرف انہیں نظریات نے فرمانروائی کی ہے جن کے حق میں خود قلب و دماغ نے ووٹ ڈالا۔ یہاں کسی قسم کی کوئی ریشہ دوانی کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ اس نوع کی جو کوشش بھی کی جاتی ہے وہ اس سلطنت کے اندر بغاوت کے شعلے بھڑکانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ ہر جبر کا یہاں ایک شدید ردِ عمل پیدا ہوتا ہے، اور ہر ظلم یہاں جذبات کو مشتعل کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جبرہ دستوں کو کبھی بھی مدتِ دراز تک ریشہ دوانیوں کی مہلت نہیں ملی۔ انہوں نے جب بھی اقتدار کے نشے میں بدقسمت ہو کر محض قوت کے زور سے اپنی مرضی کو عوام پر مسلط کرنا چاہا تو اُن کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت اور حقارت کا ایک شدید جذبہ رونما ہوا جس نے آہستہ آہستہ ایک خطرناک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور اُس نے بالآخر اس بپھرے ہوئے اقتدار کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

تاریخ کا یہ ایک نہایت ہی اہم سبق ہے جسے ہر ہوشمند صاحبِ اختیار نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ اُس نے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی تو مختلف کوششیں کیں لیکن کبھی رائے عامہ کو پائے استحقار سے ٹھکرانے کی حماقت نہ کی کیونکہ وہ اس حرکت کے نتائج سے پوری طرح آگاہ تھا اسے یہ حقیقت معلوم تھی کہ عوام کا مکمل اعتماد حاصل کیے بغیر جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے وہ ہمیشہ ناکام اور نامراد ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں غفلت اقتدار کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہے۔ جس فرد یا گروہ نے اس بنیادی حقیقت سے صرف نظر کیا اُسے اپنے اخلاص، سوز مندی اور محنت کے باوجود ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُس کی نیک نیتی، قوم اور ملک سے گہری محبت بھی اس کی اس لغزش کی تلافی نہ کر سکی۔

ہٹلر اور مسولینی کی حب الوطنی اور قوم پرستی میں آخر کس کو شک ہو سکتا ہے۔ اُن کی جرأت اور پیہم جدوجہد کے بارے میں کسے کلام ہے لیکن ان کی یہ ساری انسانی صفات اُس بنیادی کمزوری کے مقابلے میں بالکل بیکار ثابت ہوئیں جو انہوں نے قوم سے معاملہ کرنے میں دکھائی تھی۔ انہوں نے لوگوں کے اندر محض نفرت کے جذبات اُبھار کر انہیں اپنی رائے کا غلام بنانا چاہا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی قوم سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اُس کی پیروی کرتی چلی جائے اور شعور کو اپنے عمل میں دخیل نہ ہونے دے۔ لیکن اس مطالبہ کا جو حشر ہوا وہ آج سب کے سامنے ہے۔ جرمنی جیسی عظیم بالشان قوم آج جس کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہی ہے اُس پر ہر صاحبِ دل خون کے آنسو بہاتا ہے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اُس سے کہیں زیادہ کمزور قومیں اپنی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئیں لیکن اس آزاد منش قوم کو غلامی کی زنجیریں پہننی پڑیں۔ کیا اس میں ہمت و جرأت کا فقدان تھا۔ کیا اس کے ذرائع دوسری قوموں سے کم تھے۔ کیا اس کے پاس اسلحہ اور بارود کی قلت تھی؟ کیا اس کے رہنماؤں کا اخلاص مشتبہ تھا۔ کیا اُن کے اندر تدبیر کی صلاحیتیں ناپید تھیں؟ کیا وہ دوسری اقوام کے رہنماؤں کی طرح حوصلہ مند نہ تھے۔ آخر ان میں کس چیز کی کمی تھی کہ انہوں نے اتنی زبردست قوم کو برباد کر کے رکھ دیا۔ ان مختلف سوالات کا تاریخ صرف ایک ہی جواب دیتی ہے کہ ان میں اخلاص اور جوشِ عمل کی کمی نہ تھی بلکہ فہم و فراست کا فقدان تھا۔ انہوں نے محض اپنی حماقت سے قوم کو ذی شعور افراد کا ایک

منظم گروہ سمجھنے کی بجائے بے شعور بھیڑوں کا گلہ سمجھا اور پھر اُسے میکانکی طور پر محض ڈنڈے کے زور سے ہانکنے کی مذموم کوشش کی۔ جب تک جذبات متلاطم رہے اور احساسات میں اشتعال موجود رہا اُس وقت تک عوام کا فہم و شعور دبا رہا اور وہ بیچارے ان احمق لیڈروں کے اشاروں پر بلا چون و چرا کٹتے رہے۔ لیکن جذبات کی شدت کو دیر تک برقرار نہ رکھا جا سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھٹھری ہوئی فکری قوتوں میں حرکت نمودار ہوئی اور جو دماغ جذبات کی پیہم یلغار کی وجہ سے سُن ہو چکے تھے انہوں نے اپنے حالات پر غور کرنا شروع کیا اور وہ اس حقیقت کو سمجھنے لگے کہ انہیں موت کے خوفناک گڑھے کی طرف لاشعوری طور پر دھکیلا جا رہا ہے۔ فسطائیت جیسے جس غیر انسانی فلسفے پر ان کی پرورش ہو رہی تھی وہ اُن کے اندر عقل و فکر کی قوتوں کو برباد کر کے ان کے اندر وقتی جوش اور ہیجان تو پیدا کر سکتا تھا لیکن اس سے کسی قسم کی مستقل تعمیر کا کام نہیں لیا جا سکا۔ یہ ایک منفی داعیہ ہے جسے صرف نفرت و حقارت کے جذبات سے قوت مہیا کی جاتی ہے۔ اس میں کسی صحت مند انقلاب کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے۔

یہ احساس جس سرعت کے ساتھ لوگوں کے اندر بیدار ہوتا گیا اُسی رفتار کے ساتھ اُن کے افعال و اعمال پر افسردگی چھانے لگی۔ ہٹلر کے قاہرانہ نظام کے تسلّط کی وجہ سے عوام بظاہر خاموش تھے اور اُن کے اعضا اُس کے احکام کے مطابق حرکت بھی کرتے تھے لیکن یہ سب کچھ بددلی کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ جس عمل کو وجدان کی تائید اور عقل و فکر کی حمایت حاصل نہ ہو وہ کبھی بھی دنیا میں موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔ اُس کی حیثیت اُس بُلبلے کی سی ہے جس کا سارا دارومدار صرف جھوٹے پراپیگنڈہ پر ہو اور جسے حقیقت کا ایک خفیف سا جھونکا بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دے۔

وہ کام جس کے بارے میں انسان کا وجدان قدم قدم پر پکار کر کہتا ہو کہ یہ غلط ہے اور اُس کا شعور ہر گام پر اُس کے باطل ہونے کی دہائی دے، اُس کام کے متعلق انسان کے اندر کبھی بھی اخلاص پائیداری، سوز مندی اور یکسوئی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جس راستہ کے پُرخطر ہونے کا ایک فرد کو مکمل احساس ہو اُس راستے پر آخر وہ خوش دلی کے ساتھ کیونکر گامزن ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے آپ ڈرا دھمکا کر چند قدم

ہانکنے میں کامیاب ہوجائیں۔ لیکن وہ ہر لمحہ آپ کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کرے گا اور اُسے جس وقت راہ فرار ملے گی وہ اُسی وقت بھاگ نکلے گا۔ خوف وہراس وجدان اور شعور کو کچھ دیر کے لیے بے بس تو بنا سکتا ہے لیکن انہیں تبدیل نہیں کرسکتا۔ اُن کی تبدیلی کی ہر تحریک اندر سے بیدار ہوتی ہے اور اس کے منظم کرنے کا اگر خاطر خواہ انتظام نہ کیا جائے تو قوت کا مظاہرہ خواہ وہ کتنے وسیع پیمانہ پر ہی کیوں نہ ہو اُلٹے نتائج پیدا کرتا ہے۔

آپ اگر پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں کے برسرِاقتدار طبقہ نے ہمیشہ طاقت کے زور سے عوام سے اپنی بات منوانے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی عنانِ اختیار آتی ہے وہ فوج پولیس اور انتظامیہ کی قوت کا بے دریغ استعمال کرتا ہے اور اس کی مدد سے ایک طرف تو اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جماتا ہے اور دوسری طرف لوگوں سے اس امر کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دلوں پر اُس کا بلا شرکتِ غیر تسلط تسلیم کرلیں۔ وہ اپنے اندازِ حکمرانی سے عوام پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ میر امن الخطا ہے۔ اس وجہ سے وہ کسی مشاورت کا ضرورتمند نہیں اور کسی رائے کا محتاج نہیں۔ وہ جو کردے اور جو کہہ دے وہی درحقیقت تقاضائے فطرت ہے۔ لوگوں کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ اُس کی ذاتی رائے کو ملک کا قانون سمجھیں، اُس کے ذاتی افکار و نظریات پر اپنی معاشرتی زندگی کی تعمیر کریں۔ وہ جس بات کو حق کہہ دے لوگ اُسے حق جانیں اور اُس کی زبانِ فیض ترجمان سے جس چیز کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر ہوجائے اُسے وہ بغیر کسی تردّد کے باطل مان لیں۔ الغرض لوگوں کے ضمیر، شعور اور وجدان حاکم کے نظریات کے یکسر تابع ہوں۔

ایک طرف اقتدار کا پاکستانی عوام سے یہ غیر انسانی اور غیر فطری تقاضا ہے اور دوسری طرف عوام اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ نہیں پاتے کہ وہ اقتدار کو کبریائی کے ایسے اونچے مقام پر

قائم کردیں جہاں اُس کی کسی رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ دنیا کی کوئی باشعور قوم یہ منصب خدا اور اُس کے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی اونچے سے اونچے فرد یا کسی منظم سے منظم گروہ کو دینے پر تیار نہیں ہو سکتی۔ افراد کی فطرت اُن سے بار بار اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ انہیں جو کچھ کہا جا رہا ہے یا جو کچھ مختلف پروگراموں کی شکل میں اُن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اُس پر اُن کے دل و دماغ کو مطمئن کیا جائے۔ کیونکہ قلبی اطمینان حاصل کیے بغیر وہ چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ہمارے اس ملک میں پندرہ سال سے زندگی کے ہر شعبہ میں جو شدید کشمکش نظر آتی ہے وہ حکمران طبقوں کی اسی احمقانہ ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ وہ خواہ زبان سے یہ بات نہ کہیں لیکن اُن کا اپنی قوم سے سب سے اہم مطالبہ صرف ایک ہے کہ وہ غور و فکر اور تدبر و تفکر کے انسانی بنیادی حق سے یکسر دست بردار ہو جائیں اور یہ کام پوری خوش دلی اور نیک نیتی کے ساتھ صرف تخت و تاج کے وارثوں کو تفویض کر دیں اور اگر وہ یہ ایثار اور قربانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو پھر وہ ملک کے غدار اور غیر ملکی سامراج کے ایجنٹ ہیں۔ اُن کی حب الوطنی اور قوم سے محبت کا راز صرف حکمران طبقہ کی غیر مشروط اطاعت اور چاکری میں مضمر ہے

آپ اگر قیامِ پاکستان سے لیکر اس وقت تک کی سرکاری کارگزاریوں کا جائزہ لیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس ملک میں جو بھی برسرِ اقتدار آیا اُس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو عوامی احساسات و جذبات سے بیگانہ بنانے کی کوشش کی تاکہ وہ پوری شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنی مرضی کو عوام پر مسلط کر سکے۔ اس نے اپنے کردار اور طرزِ عمل سے یہ ثابت کیا کہ یہ ملک انسانوں سے آباد نہیں بلکہ بے زبان جانوروں سے بھرا پڑا ہے اس لیے اُسے کسی کی آواز پر کان دھرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ملکی دستور جیسے اہم مسئلے سے لیکر معمولی سے معمولی معاشرتی سرگرمیوں تک میں عوامی رائے کو یکسر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور لوگوں نے جب بھی ان معاملات میں لب کشائی کی تو اُن کے سینے یا تو گولیوں سے چھلنی کیے گئے یا سیفٹی ایکٹ جیسے غیر انسانی

قوانین کا سہارا لے کر انہیں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا یا اُن پر غداری اور وطن دشمنی کا الزام لگا کر انہیں عوام میں بدنام کرنے کی تدبیریں سوچی گئیں۔ ان عقل کے اندھوں نے اپنے بھائی بندوں سے لڑنا تو پسند کیا لیکن کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ آخر یہ سارے لوگ دیوانے تو نہیں ہو گئے کہ وہ خواہ مخواہ اُن سے ہر معاملہ میں اُلجھ رہے ہیں۔

یہاں دستور کی ترتیب کے لیے کئی مرتبہ مختلف کمیٹیاں قائم کی گئیں لیکن ہر بار رائے عامہ سے تغافل برتا گیا۔ یہاں آرٹ اور کلچر کے نام پر فحاشی اور بد معاشی کو فروغ دیا گیا اور لوگوں نے اس روش کے خلاف جب آواز اٹھائی اور کہا کہ یہ آرٹ جسے یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ مغرب کی اندھی تقلید میں فروغ دینا چاہتا ہے وہ اس قوم کے مزاج کے سراسر منافی ہے اور اس کے رواج پانے سے اس کی اخلاقی اقدار تباہ و برباد ہو نگی، تو اس طبقے نے استکبار کے لہجہ میں کہا: "یہ ایک وحشت اور دیوانگی کی آواز ہے جو تنگ نظر اور سرپھرے ملاؤں کے حجروں سے بلند ہو رہی ہے"۔ اس سے آگے بڑھ کر جب اس طبقے نے اس قوم کی عائلی زندگی کو درہم برہم کرنے کے لیے عائلی قوانین وضع کیے تو پوری قوم نے یک زبان ہو کر اس کی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ ان قوانین کے نفاذ سے اس قوم کی معاشرتی زندگی میں ایک زبردست بگاڑ پیدا ہو گا۔ لیکن حکمرانوں نے ان کی کسی بات پر توجہ نہ دی بلکہ قوت کے زور سے انہیں خاموش کرنا چاہا۔

اس طبقہ کی عوامی احساسات سے یہ سرد مہری بلکہ تغافل اور بے پروائی دیکھ کر انسانی ذہن میں اُن یونانی دیوتاؤں کا تصور گھومنے لگتا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ انسانی آبادیوں سے بہت دُور بالکل الگ تھلگ ہو کر پہاڑوں پر عیش و آرام کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ انہیں انسانوں کے مسائل، اُن کی مشکلات اور پریشانیوں اور اُن کے جذبات سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا، اور انہوں نے کبھی انسانوں کے مصائب و آلام کے متعلق سوچ کر اپنے آپ کو رنجیدہ خاطر کرنا پسند نہ کیا۔ انسانی بستیاں زلزلوں کی وجہ سے زیر و زبر ہوتیں، لوگ برباد ہوتے اور اس مصیبت کے عالم میں آہ و فغاں بلند کرتے لیکن یہ بے حس دیوتا اس نالہ و فریاد سے موسیقی کا لطف حاصل کرتے۔ جب جہاز ڈوبتے اور لوگ اپنی جانیں بچانے

کے لیے سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگتے تو ان دیوتاؤں کو اس میں رقص کا مزہ آتا۔ انسانی آبادیوں میں جب جنگ و جدال شروع ہوتا، یا قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا یا بیماری اور قحط کی وجہ سے لوگ مختلف مصائب میں گرفتار ہوتے تو ان روح فرسا واقعات اور حوادث کو دیکھ کر ان دیوتاؤں کو قلبی مسرت ہوتی کیونکہ یہ بھیانک مناظر اُن کے لیے تفریح طبع کا سامان تھے۔

ٹھیک یہی یا اس سے ملتا جلتا رویہ اس ملک کے اصحابِ اقتدار نے یہاں کے عوام کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔ معلوم نہیں انہیں اس ملک کے باشندوں کو تنگ کرنے میں کونسی لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ برابر اس امر کا التزام کرتے رہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طرح ضرور ستایا جائے۔ یہ لوگ جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں جن سے ان بیچاروں پر عرصۂ حیات تنگ ہو، ان کے جذبات اور احساسات مجروح ہوں اور پھر وہ واویلا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں۔ آپ دور نہ جائیے بالکل سامنے کی ایک مثال لیجیے۔

اس ملک میں جو نظامِ تعلیم و تربیت انگریز نے رائج کر رکھا تھا وہ اس ملک کے باشندوں کے عزائم اور مقاصد کی تکمیل نہ کر سکتا تھا۔ یہ ایک غیر ملکی سامراج کا مرتب کردہ نظام تھا جسے آزادی کی صبح طلوع ہونے کے ساتھ ہی بدل دینے کی اشد ضرورت تھی تاکہ ہم اپنی نوخیز نسلوں کی دینی و ملی ضروریات کے تحت صحیح طریق سے تربیت کر سکیں۔ ان حالات کے تحت قوم کو اس امر کی بجا طور پر توقع تھی کہ اس ملک کے نظامِ تعلیم میں اب جو تبدیلی بھی کی جائے گی اُس میں ہمارے قومی مزاج، ہماری روایات، ہمارے افکار و نظریات اور ہمارے ملکی حالات کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں فی الواقع جو کچھ ہُوا ہے وہ انتہائی مایوس کُن اور افسوسناک ہے۔ یُوں نظر آتا ہے کہ کسی غیر ملکی آمر نے جسے اس ملک کے باشندوں کی نفسیات اور اُن کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس نے محض ستانے کی غرض سے اسے عوام پر ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔

اس تبدیل شدہ نظام کا جائزہ لیجیے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ اس میں سرے سے وہ

بنیادہی غائب ہے جس پر کسی صحت مند نظامِ تعلیم کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ دنیا کا ہر نظام سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ اسے اپنی نوجوان نسل کو کس کلچر کا خادم بنانا ہے، اس کے دماغ میں کس قسم کے افکار و تصورات کی آبیاری کرنی ہے اور اُس کے دل میں کن اقدارِ حیات کا نقش بٹھانا ہے تاکہ اُس کے فکر و عمل اور جذبہ و احساس میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

آپ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کو اوّل تا آخر پڑھ جائیں آپ کو کہیں بھی اُس بنیادی نقطۂ نظر کی جھلک نہ ملے گی جو کسی نظامِ تعلیم کی جان ہوتا ہے۔ یہاں مختلف اقوام کے تصورات کو نہایت ہی بھونڈے انداز سے ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کو اگر اس فکری انتشار کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو صرف ایف۔ اے کے انگریزی نصاب کی ایک کتاب "ہوا کے دوش" کا ذرا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں کس قسم کے بے ربط خیالات کو کس نامعقولیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نوعیت کی کتابیں پڑھنے والے ملّت کی جو فکری رہنمائی کریں گے تو اس کا تو بخوبی اندازہ ہو ہی سکتا ہے۔ میرے نزدیک اگر وہ اپنا دماغی توازن ہی برقرار رکھ لیں تو یہی اُن کی ذہانت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ یہ عقل و فکر کو جلا دینے والی کتاب نہیں بلکہ اُن کی دماغی قوتوں کو منتشر کرنے والا ایک بیکار مجموعہ ہے جس سے بچے کی ذہنی صلاحیتیں نشو و نما پانے کی بجائے ٹھٹھر کر رہ جائیں گی۔ ملک کے ماہرینِ تعلیم ذرا اُن بچوں سے رابطہ قائم کر کے اُن کی آرا معلوم کریں جنہیں قوت کے زور سے اس آزمائش میں جھونک دیا گیا ہے۔

پھر اس نظامِ تعلیم کے مرتب کرنے والوں نے شروع ہی سے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ دنیا کی کوئی ہوشمند قوم اپنے ہاں تعلیم و تربیت کا کوئی ایسا نظام قائم نہیں کرتی جسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے دوسروں کے سامنے ہر مرحلہ پر دستِ سوال دراز کرنا پڑے۔ نظامِ تعلیم کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی کہ کسی فرد کی زندگی میں سانس۔ آپ کپڑے کے معاملے میں کسی دوسرے کے محتاج ہو سکتے ہیں، خوراک اور اپنی دوسری ضروریات کی فراہمی کے لیے کسی دوسرے پر انحصار کر سکتے ہیں لیکن آپ کی زندگی کے لیے اُس سے زیادہ منحوس دن کوئی نہیں ہو سکتا جب آپ سانس

کسے لیے دوسروں کے دست نگر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنی زندگی پر قطعاً کوئی اختیار باقی نہیں رہا وہ سراسر دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہے اور وہ جب چاہے اپنی منشا اور مرضی کے مطابق آپ کی حیات کا چراغ گل کر دے۔ آخر سوچیے کہ دنیا کا کوئی کمزور سے کمزور انسان بھی اپنی زیست کے بارے میں یہ ذلیل موقف قبول کر سکتا ہے۔

ایک انسان جس طرح جسم و روح کے تعلق کے قائم رکھنے میں دوسروں کا محتاج نہیں بننا چاہتا، بالکل اسی طرح دنیا کی کسی عقلمند قوم نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنی نوخیز نسلوں کی اخلاقی تربیت اور ذہنی نشوونما کے لیے دوسروں پر بھروسہ اور اعتماد کرے۔ کیونکہ اس دائرۂ کار میں اعتماد بسا اوقات قوموں کی ہستی کو ہی مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ حیاتِ اجتماعی میں نظامِ تعلیم روح کی حیثیت رکھتا ہے اور کوئی قوم خواہ وہ معاشی اعتبار سے کتنی ہی بدحال ہو لیکن اگر اُس میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا داعیہ موجود ہے تو وہ روح کی غلامی پر کبھی بھی رضامند نہیں ہو سکتی۔

ہٹلر کی جذباتیت شوریدہ سری اور آمریت سے کون ناواقف ہے لیکن اُسے بھی خداوند تعالیٰ نے یہ سمجھ بوجھ دے رکھی تھی کہ اُس نے عین زمانہ جنگ میں جب اُس کی طرف ہر طرف سے آگ کے شعلے لپک رہے تھے، بچوں کی تربیت سے معمولی غفلت بھی نہ برتی بلکہ انہیں ان پُرآشوب حالات میں ملک سے نکال کر سوئٹزرلینڈ بھیج دیا تاکہ وہ وہاں یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اُس کے ایک رفیقِ کار نے جب ایک موقع پر اس کی علت دریافت کی تو اُس نے جواب میں کہا: اگر ان بچوں کو ہم اپنے قومی عزائم کے تحت تربیت دینے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر جرمن قوم کو مٹانا ناممکن ہو گا۔ جو صفیں خالی ہونگی انہیں کل بڑی آسانی کے ساتھ پُر کیا جا سکے گا۔ لیکن اگر ایک مرتبہ ہمارے ہاں خلا پیدا ہو گیا تو پھر اس قوم کو بربادی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

اسے ہماری بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے تعلیمی کمیشن نے ہمارے لیے جو

نظامِ تعلیم تجویز کیا ہے ہمارے اپنے وسائل اُس کے کسی طرح بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم اُس کے نفاذ کے لیے اور پھر اُسے کامیابی کے ساتھ چلانے کیلیے یکسر دوسروں کی امداد کے محتاج ہیں۔ ہمارے نزدیک ان سفارشات کا سب سے تکلیف دہ اور تاریک پہلو یہی ہے کہ امریکہ کی خیرات کے بغیر یہ ایک دن بھی کامیابی کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے ابتدائی نتائج تو کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ وہ ادارے جو اگرچہ سرکاری نصاب اپنے ہاں پڑھا رہے تھے لیکن جو کسی حد تک اپنی آزادی کو بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اپنے آپ کو بالکل حکومت کی تحویل میں دینا پسند نہ کرتے تھے وہ یا تو ایک ایک کر کے دم توڑ رہے ہیں یا اپنی آزادی کو مالی امداد کے عوض رہن رکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

یہ صورتِ حال کسی جمہوری ملک کے لیے انتہائی تشویشناک ہے۔ دنیا کا ہر جمہوری ملک اس بات کا پورا پورا التزام کرتا ہے کہ لوگوں کے اندر حریتِ فکر اور ضمیر کی آزادی پوری طرح پرورش پائے کیونکہ ان کی صحت مند نشوونما پر ہی جمہوریت کی کامیابی کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ انگلستان اور امریکہ میں اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ تعلیمی ادارے حکومت کے تسلط سے جہاں تک ممکن ہو آزاد رہیں۔ ان اداروں کو زیادہ تر فلاحی انجمنیں چلاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے گہواروں سے جو نوجوان تعلیم حاصل کر کے زندگی کے میدان میں نکلتے ہیں اُن کے اندر ضمیر کی کافی آزادی پائی جاتی ہے۔ انگلستان کی دو مشہور یونیورسٹیاں کیمبرج اور آکسفورڈ مخیر حضرات کے چندوں پر نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔ انگلستان کے بہترین دماغوں نے انہی یونیورسٹیوں میں جلا پائی ہے۔

پاکستان میں جو نظامِ تعلیم رائج کرنے کا منصوبہ تیار ہوا ہے وہ اس نقطۂ نظر سے انتہائی مایوس کن ہے۔ اس میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ تعلیمی اداروں کی آزادی پوری طرح سلب کر لی جائے تاکہ اُن کے اندر حریتِ فکر کا کوئی احساس باقی نہ رہے۔ معلم اور متعلم دونوں حکومت کے براہِ راست دست نگر ہوں اور حکومت ان کے اندر جس قسم کے خیالات اور احساسات کی پرورش کرنا چاہے وہ بڑی آسانی کے

سانٹھ کر سکے۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں تعلیم کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی بلکہ اس کی جکڑ بندی کی فکر کی گئی ہے۔ اسے دیکھ کر تو روسی نظامِ تعلیم کی تہ بانیوں کا تصور آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

تعلیم و تعلّم پر یہ ناروا پابندی بلکہ مجنونانہ جکڑ بندی اگر ملی تقاضوں کے تحت ہوتی تب بھی شاید عوام اسے ملکی اور قومی مفاد کے نام پر کسی حد تک گوارا کر لیتے لیکن اس کے پیچھے جو محرکات کارفرما ہیں ان میں ملی مفادات کا عنصر یکسر ناپید ہے۔

اس جکڑ بندی کا سب سے پہلا اثر یہ ہوگا کہ تعلیم صرف امراء کے طبقہ میں محدود ہو کر رہ جائے اور بے چارے عوام اس سے یکسر محروم ہوں گے۔ یہ چیز ملکی مفاد کے سراسر منافی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم صرف انہی لوگوں کو حاصل کرنی چاہیے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور باقی افراد کو صنعتی تربیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک نہایت ہی بھونڈی دلیل ہے۔ اوّل یہ کہ امتحان کسی شخص کی قابلیت کا واحد معیار نہیں ہو سکتا۔ بہت سی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں جن میں نہایت معمولی نمبروں سے لوگوں نے امتحانات پاس کیے لیکن جب انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو وہاں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ پھر اس ملک میں حکومت نے کتنے ایسے صنعتی ادارے قائم کر رکھے ہیں جن میں لوگ حسبِ خواہش تربیت حاصل کر سکتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر پاکستان کے لیے تعلیمی لائحۂ عمل تیار کرنا اگر ابلہ فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

اس غریب ملک کے لیے جس کی دولت کا معتد بہ حصہ صرف دو سو خاندانوں کے اندر گردش کر رہا ہے ایک ایسا نظامِ تعلیم تجویز کیا گیا ہے جس سے ملک کی عظیم اکثریت قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف چند مالدار گھرانوں کے بچے تعلیم سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ یہ وہ خاندان ہیں جن کے اندر مغربی اقدارِ حیات کی پوری طرح پرستش ہوتی ہے۔ آپ ان سے تعلق رکھنے والے افراد سے اگر رابطہ قائم کریں تو آپ کو

معلوم ہوگا کہ یہ حضرات مغرب کی ذہنی غلامی میں بُری طرح گرفتار ہیں۔ ان کے افکار و نظریات، احساسات و جذبات، عادات و خصائل اور طرزِ معاشرت، الغرض ان کی پوری زندگیاں مغربی تہذیب میں رنگی ہوتی ہیں۔ سوائے رنگ اور نسل کے اشتراک کے، ان کے اور ملک کی عام آبادی کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانے اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے، بلکہ ان کی بستیاں بھی عام لوگوں سے الگ تھلگ ہیں۔ ان کا ملک کے باشندوں اور ان کے احساسات سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ کسی غیر ملکی کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ ملک کی عنانِ اقتدار تھام کر اسلامی کلچر کی خدمت کریں گے ایک ایسی خوش فہمی ہے جس کے ڈانڈے حماقت اور بیوقوفی سے ملے ہوتے ہیں۔ اس گروہ کے کسی فرد کے پاس چلے جائیے اور اُس سے بات کر کے دیکھیے، آپ اسے سوائے رنگ کے ہر لحاظ سے انگریز یا امریکی پائیں گے۔

اس نئے نظامِ تعلیم کے نتیجے میں جب تعلیم کا حصول صرف اسی ایک طبقہ کی اجارہ داری بن جائے گی تو پھر ملکی معاملات میں قیادت اور سربراہی کا منصب بھی لازمی طور پر بلا شرکتِ غیرے انہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ غریب اور متوسط طبقے ملک کے انتظام و انصرام سے آہستہ آہستہ بے دخل ہوتے چلے جائیں گے اور ملک کی قسمت کا فیصلہ صرف ان "صاحب بہادروں" کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ جس ڈگر پر چاہیں گے ملک کو چلا لے جائیں گے۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے ہر صاحبِ فہم اچھی طرح جانتا ہے۔

ایک طرف تو ملک کے اندر تعلیم کو مغرب پرست طبقہ کے اندر مقید کیا جا رہا ہے اور اس پر مزید ستم یہ ہے کہ جو نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی گئی ہے اس کے ترتیب دینے والے یا تو غیر ملکی لوگ ہیں یا اپنے ملک کے ایسے افراد جو اہلِ پاکستان کے عزائم کی نمائندگی کرنے کی بجائے امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کے احساسات کی ترجمانی کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ اِن "ایرانِ دانشِ فرنگ" کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن پر قطعاً کوئی اعتماد نہیں بلکہ اُن کے قلب و دماغ کو مغربی

اقدارِ حیات نے پوری طرح مفتوح کر رکھا ہے۔ چنانچہ جو تعلیمی پالیسی طے کی گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے اندر صرف اِمراء کا طبقہ جو مغربی تمدن کی ظاہری چمک دمک سے پہلے ہی سخت مرعوب ہے تعلیم سے بہرہ مند ہوگا اور اس طبقہ کی قیادت اور رہنمائی براہِ راست وائٹ ہاؤس سے ہوا کرے گی کیونکہ "آقائے ولی نعمت" کی نظرِ کرم کے بغیر اس نظام کو اس ملک میں کامیابی کے ساتھ چلایا نہیں جا سکتا

ابھی یہ سطور لکھی جا رہی تھیں کہ حکومت نے سہ سالہ ڈگری کورس کی بجائے دو سالہ ڈگری کورس کا اعلان کر دیا۔ اس تبدیلی کا میری ان گزارشات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک سال کی کمی بیشی سے وہ سارا نقطۂ نظر تبدیل نہیں ہو سکتا جو اس تعلیمی پالیسی کے اندر کار فرما ہے۔ البتہ اس اعلان سے پھر ایک مرتبہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ہمارے برسرِ اقتدار طبقہ کو عوامی احساسات اور اہلِ وطن کی دشواریوں کی قطعاً کوئی خبر نہیں ہوتی اور انہیں اپنے مصائب اور اپنی مشکلات سے آگاہ کرنے کے لیے وہی حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں جو انگریزی عہد میں صاحب بہادر کو جھنجھوڑنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ "بدیشی صاحب" کی یہ بے خبری تو کچھ سمجھ میں آتی ہے لیکن ان دیسی آقاؤں کی "شانِ بے نیازی" دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کیا یہ لوگ باشندگانِ ملک کے حالات سے اتنے غافل ہیں کہ انہیں اپنی قوم پر کوئی بوجھ لادتے وقت یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمارے عوام اس بوجھ کو برداشت کرنے کی سکت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ انگریز اگر یہ ظالمانہ روش اختیار کرتا تھا تو اس کی ایک وجہ تھی۔ اس کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ وہ لوگوں کو تنگ کر کے انہیں دق کر کے اور ستا کر اُن کا ردِ عمل معلوم کرے اور یہ دیکھے کہ ابھی ان میں کتنی جان باقی ہے اور اسے ختم کرنے کے لیے اُسے کونسی نئی پالیسی مرتب کرنا ہے۔ لیکن اپنے بھائی بندوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی ملت کے صبر کا مسلسل امتحان لیتے رہیں۔ صبر کی بھی بہرحال ایک حد ہے اور اس پیمانہ میں خواہ کتنی

وسعت ہو لیکن ایک وقت ضرور ایسا آتا ہے جب یہ ساری وسعتوں کے باوجود چھلک پڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ نوبت آئے لیکن اہلِ ملک کو جس طریق سے پریشان کیا جارہا ہے اُسے دیکھ کر یہ چیز کوئی بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی

یہ گزارشات ہم کوئی سنسنی پیدا کرنے یا خوف وہراس پھیلانے کی غرض سے نہیں کر رہے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے۔ جب ایک بھائی ہی اپنے بھائیوں کو بلاوجہ آزمائشوں کی بھٹی میں جھونکنا شروع کر دے تو حقارت اور نفرت کے جذبات میں زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس شخص کو انسان اپنا دمساز اور دلسوز رفیق سمجھتا ہو اُس سے تو اُسے فطرتاً یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اُس کی مشکلات اور پریشانیوں سے پُوری طرح آگاہ ہوگا بلکہ اُن میں برابر کا شریک بھی ہوگا اور اپنے وسائل کے مطابق انہیں حتی المقدور دور کرنے کی کوشش کریگا۔ قومی احساسات کے معاملے میں یہ بیگانگی ممکن ہے برسرِ اقتدار طبقہ کے جذبۂ کبر کے لیے کسی حد تک تسکین کا سامان فراہم کر سکے لیکن اس کی وجہ سے قوم کے اعتماد کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ عوام یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان حاکموں کا ہمارے ساتھ سوائے ٹیکس وصول کرنے اور سزائیں دینے کے اور کوئی سروکار نہیں۔ جب دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے تو پھر وہ کسی صحیح بات کے لیے بھی خوش دلی اور اخلاص کے ساتھ برسرِ اقتدار طبقے کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اس طرح ایک ملت کے اندر ہی اختلافات کی ایسی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے جسے کوئی نعرہ بازی پاٹ نہیں سکتی۔

ہم اس ملک کے برسرِ اقتدار طبقہ کی خدمت میں پُورے اخلاص کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ براہِ کرم اپنی روش بدلنے کی کوشش کیجیے۔ یہ قوم جس پر آپ کو حکمرانی کا موقع ملا ہے آپ کی اپنی قوم ہے۔ خدارا اس کے احساسات کی گہرائیوں میں اُتر کر اُن کی وسعت، گہرائی اور نوعیت کا صحیح صحیح اندازہ لگائیے۔ اور یہ دیکھیے کہ یہ قوم آخر تم سے کس چیز کی توقع رکھتی ہے اور اس کے مطالبہ میں

کتنی معقولیت ہے۔ آپ کی حقیقی عزت یہ نہیں کہ کوئی غیر ملکی اخبار آپ کی تصویر شائع کردے یا آپ کے بارے میں کلمۂ خیر کہہ دے، یا کسی ملکہ کے حضور میں آپ کو شرف باریابی نصیب ہو جائے، یا آپ کو کسی شاہی دسترخوان میں شرکت کا موقع ہاتھ آجائے یا ملک کے چند چاپلوس آپ کی مدح میں کچھ قصائد پڑھ دیں۔ یہ سب چیزیں نقش برآب ہیں، تاریخ نے انہیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس قسم کے سارے اعزاز جن پر آپ بڑے مسرور نظر آتے ہیں اپنے اپنے عہد میں ان سارے لوگوں کو بھی میسر تھے جن پر آج پوری نوع بشری لعنت بھیجتی ہے۔ آپ کی حقیقی عظمت کا راز اپنی قوم کے دل مسخر کرنے میں ہے۔ اور یہ چیز اُس کے احساسات کو نظر انداز کرنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ انہیں ہمدردی اور اخلاص کے ساتھ سمجھنے اور پھر عزم اور دلسوزی کے ساتھ ان کی صحیح طریق سے تربیت کرنے سے ہاتھ آتی ہے۔

اقتدار کے تخت پر متمکن ہو کر نصیحت اور خیر خواہی کی باتیں سننا یقیناً مجاہدہ ہے۔ کیونکہ اقتدار انسان کو کافی حد تک خود پسند بنا دیتا ہے لیکن اگر آپ خود پسندی کے اس طلسم کو توڑ کر عوامی جذبات کو جاننے کی کوشش کریں تو آپ اپنے آپ پر اور اس مظلوم ملت پر بہت بڑا احسان کریں گے اور تاریخ میں آپ ایک ایسی اچھی یادگار چھوڑیں گے جو انسانیت کا بیش قیمت سرمایہ ہوگا اور آئندہ جب کبھی بھی عدل و انصاف، اور حق پرستی کا تذکرہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ آپ کا نام بھی خود بخود لوگوں کی زبانوں پر آجائے گا۔

تفہیم القرآن

فاطر

نام پہلی ہی آیت کا لفظ "فاطر" اس سورہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ یہ وہ سورۃ ہے جس میں فاطر کا لفظ آیا ہے۔ دوسرا نام "الملائکۃ" بھی ہے اور یہ لفظ بھی پہلی آیت ہی میں وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول اندازِ کلام کی اندرونی شہادت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس سورت کے نزول کا زمانہ غالباً مکہ معظمہ کا دورِ متوسط ہے، اور اس کا بھی وہ حصہ جس میں مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی بُری سے بُری چالیں چلی جا رہی تھیں۔

موضوع و مضمون کلام کا مدعا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کے مقابلہ میں جو رویہ اُس وقت اہلِ مکہ اور اُن کے سرداروں نے اختیار کر رکھا تھا اس پر ناصحانہ اور معلمانہ انداز میں اُن کو تنبیہ و ملامت بھی کی جائے اور فہمائش بھی۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نادانو، یہ نبی جس راہ کی طرف تم کو بلا رہا ہے اس میں تمہارا اپنا بھلا ہے۔ اس پر تمہارا غصہ، اور تمہاری مکاریاں اور چال بازیاں، اور اس کو ناکام کرنے کے لیے تمہاری تدبیریں دراصل اس کے خلاف نہیں بلکہ تمہارے اپنے خلاف پڑ رہی ہیں۔ اس کی بات نہ مانو گے تو اپنا ہی کچھ بگاڑو گے، اس کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ جو کچھ تم سے کہہ رہا ہے اس پر غور تو کرو، آخر اس میں غلط کیا بات ہے۔ وہ شرک کی تردید کرتا ہے۔ تم خود آنکھیں کھول کر دیکھو، کیا شرک کے لیے دنیا میں کوئی معقول بنیاد موجود ہے؟

وہ توحید کی دعوت دیتا ہے۔ تم خود عقل سے کام لے کر غور کرو، کیا اللہ فاطر السماوات والارض کے سوا کہیں کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جو خدائی کی صفات اور اختیارات رکھتی ہو؟ وہ تم سے کہتا ہے کہ تم اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہو بلکہ تمہیں اپنے خدا کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں ہر ایک کو اپنے کیے کا نتیجہ دیکھنا ہوگا۔ تم خود سوچو کہ اس پر تمہارے شبہات اور اچنبھے کس قدر بے اصل ہیں۔ کیا تمہاری آنکھیں رات دن اعادۂ خلق کا مشاہدہ نہیں کر رہی ہیں؟ پھر تمہارا ہی اعادہ اس خدا کے لیے کیوں ناممکن ہو جس نے تم کو ایک ذرا سے نطفے سے پیدا کر دیا۔ کیا تمہاری عقل یہ گواہی نہیں دیتی کہ بھلے اور بُرے کو یکساں نہ ہونا چاہیے؟ پھر تم ہی بتاؤ کہ معقول بات کیا ہے؟ یہ کہ بھلے اور برے کا انجام یکساں ہو، یعنی مٹی میں مل کر فنا ہو جانا؟ یا یہ کہ بھلے کو بھلا اور بُرے کو بُرا بدلہ ملے؟ اب اگر ان سراسر معقول اور مبنی بر حقیقت باتوں کو تم نہیں مانتے اور جھوٹے خداؤں کی بندگی نہیں چھوڑتے اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھتے ہوئے شتر بے مہار ہی کی طرح دنیا میں جینا چاہتے ہو تو اس میں نبی کا کیا نقصان ہے۔ شامت تو تمہاری اپنی ہی آئے گی۔ نبی پر صرف سمجھانے کی ذمہ داری تھی، اور وہ اس نے ادا کر دی۔

سلسلۂ کلام میں بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ جب نصیحت کا حق پوری طرح ادا کر رہے ہیں تو گمراہی پر اصرار کرنے والوں کے راہ راست قبول نہ کرنے کی کوئی ذمہ داری آپ کے اوپر عائد نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ جو لوگ نہیں ماننا چاہتے ان کے رویے پر نہ آپ غمگین ہوں اور نہ انہیں راہ راست پر لانے کی فکر میں اپنی جان گھلائیں۔ اس کے بجائے آپ اپنی توجہات اُن لوگوں پر صرف کریں جو بات سننے کے لیے تیار ہیں۔

ایمان قبول کرنے والوں کو بھی اسی سلسلے میں بڑی بشارتیں دی گئی ہیں تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور وہ اللہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے راہِ حق میں ثابت قدم ہیں۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے[1]، (ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں[2]۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے[3]۔ یقیناً اللہ ہر چیز

---

[1] اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے درمیان پیغام رسانی کی خدمت انجام دیتے ہیں، اور یہ بھی کہ تمام کائنات میں اللہ جل شانہٗ کے احکام لے جانا اور اُن کو نافذ کرنا انہی فرشتوں کا کام ہے۔ ذکر کا مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ یہ فرشتے جن کو مشرکین دیوی اور دیوتا بنائے بیٹھے ہیں ان کی حیثیت اللہ وحدہٗ لاشریک کے فرماں بردار خادموں سے زائد کچھ نہیں ہے۔ جس طرح کسی بادشاہ کے خدام اس کے احکام کی تعمیل کے لیے دوڑے پھرتے ہیں، اسی طرح یہ فرشتے کائنات کے فرمانروائے حقیقی کی خدمت بجا لانے کے لیے اُڑے پھرتے ہیں۔ اِن خادموں کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ سارے اختیارات اصل فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔

[2] ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان فرشتوں کے بازوؤں اور پروں کی کیفیت کیا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کے بجائے وہ لفظ استعمال فرمایا ہے جو انسانی زبان میں پرندوں کے بازوؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو یہ تصور ضرور کیا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کا یہی لفظ اصل کیفیت سے قریب تر ہے۔ دو دو اور تین تین اور چار چار بازوؤں کے ذکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے مختلف درجہ کی طاقتیں عطا فرمائی ہیں اور جس سے جیسی خدمت لینی مطلوب ہے اس کو ویسی ہی زبردست سرعت رفتار اور قوت کار سے آراستہ

پر قادر ہے۔ اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں ہے۔ وہ زبردست اور حکیم ہے۔[۵]

فرمایا گیا ہے۔

سے ان الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بازوؤں کی انتہائی تعداد چار ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتوں کو اس سے بھی زیادہ بازو عطا فرمائے ہیں۔ حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو ایک مرتبہ اس شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے (بخاری۔ مسلم۔ ترمذی)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے جبریل کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے۔ ان کے چھ سو بازو تھے اور وہ پورے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ (ترمذی)

سے اس کا مقصود بھی مشرکین کی اس غلط فہمی کو رفع کرنا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے کوئی انہیں روزگار دلانے والا اور کوئی ان کو اولاد عطا فرمانے والا اور کوئی ان کے بیماروں کو تندرستی بخشنے والا ہے۔ شرک کے یہ تمام تصورات بالکل بے بنیاد ہیں اور خالص حقیقت صرف یہ ہے کہ جس قسم کی رحمت بھی بندوں کو پہنچتی ہے محض اللہ عزوجل کے فضل سے پہنچتی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کے عطا کرنے پر قادر ہے اور نہ روک دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید اور احادیث میں بکثرت مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے تاکہ انسان در در کی بھیک مانگنے اور ہر آستانے پر ہاتھ پھیلانے سے بچے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہے۔

شہ زبردست ہے، یعنی سب پر غالب اور کامل اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ حکیم بھی ہے۔ جو فیصلہ بھی وہ کرتا ہے سراسر حکمت کی بنا پر کرتا ہے۔ کسی کو دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ حکمت اسی کی متقاضی ہے۔ اور کسی کو

لوگو، تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انہیں یاد رکھو۵۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ ــــ کوئی معبود اس کے سوا نہیں، آخر تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو۶؟ اب اگر (اے نبی) یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں۷ (تو یہ کوئی نئی بات نہیں)، تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں، اور سارے معاملات آخر کار اللہ ہی کی طرف رجوع ہونے والے ہیں۸۔

نہیں دیتا تو اس لیے نہیں دیتا کہ اسے دینا حکمت کے خلاف ہے۔

۵ یعنی احسان فراموش نہ بنو۔ نمک حرامی نہ اختیار کرو۔ اس حقیقت کو نہ بھول جاؤ کہ تمہیں جو کچھ بھی حاصل ہے، اللہ کا دیا ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ فقرہ اس بات پر متنبہ کر رہا ہے کہ جو شخص بھی اللہ کے سوا کسی کی بندگی و پرستش کرتا ہے، یا کسی نعمت کو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کی عطا و بخشش سمجھتا ہے، یا کسی نعمت کے ملنے پر اللہ کے سوا کسی اور کا شکر بجا لاتا ہے، یا کوئی نعمت مانگنے کے لیے اللہ کے سوا کسی اور سے دعا کرتا ہے، وہ بہت بڑا احسان فراموش ہے۔

۶ پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے کلام کا موقع و محل خود بھر رہا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہ نقشہ چشم تصور کے سامنے لائیے کہ تقریر مشرکین کے سامنے ہو رہی ہے۔ مقرر حاضرین سے پوچھتا ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہو اور جو زمین و آسمان سے تمہاری رزق رسانی کا سامان کر رہا ہو؟ یہ سوال اٹھا کر مقرر چند لمحے جواب کا انتظار کرتا ہے۔ مگر دیکھتا ہے کہ سارا مجمع خاموش ہے۔ کوئی نہیں کہتا کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق و رازق ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حاضرین کو بھی اس امر کا اقرار ہے کہ خالق و رازق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ تب مقرر کہتا ہے کہ معبود بھی پھر اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ آخر تمہیں یہ دھوکا کہاں سے لگ گیا کہ خالق و رازق تو ہو صرف اللہ، مگر معبود بن جائیں اس کے سوا دوسرے۔

۷ یعنی تمہاری اس بات کو نہیں مانتے کہ اللہ کے سوا عبادت کا مستحق کوئی نہیں ہے، اور تم

لوگو، اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے[10]، لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے[11] اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے[12]۔ درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لیے بلا رہا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں۔ جو لوگ کفر کریں گے[13] اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے[14]۔ ع ۱ع

پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ تم نبوت کا ایک جھوٹا دعویٰ لیکر کھڑے ہو گئے ہو۔

۹ یعنی فیصلہ لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ جسے وہ جھوٹا کہہ دیں، وہ حقیقت میں جھوٹا ہو جائے۔ فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ آخر کار بتا دے گا کہ جھوٹا کون تھا اور جو حقیقت میں جھوٹے ہیں انہیں ان کا انجام بھی دکھا دیگا۔

۱۰ وعدے سے مراد آخرت کا وعدہ ہے جس کی طرف اوپر کے اِس فقرے میں اشارہ کیا گیا تھا کہ تمام معاملات آخر کار اللہ کے حضور پیش ہونے والے ہیں۔

۱۱ یعنی اِس دھوکے میں کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے، اِس کے بعد کوئی آخرت نہیں ہے جس میں اعمال کا حساب ہونے والا ہو۔ یا اِس دھوکے میں کہ اگر کوئی آخرت ہے بھی تو جو اِس دنیا میں مزے کر رہا ہے وہ وہاں بھی مزے کرے گا۔

۱۲ "بڑے دھوکے باز" سے مراد شیطان ہے، جیسا کہ آگے کا فقرہ بتا رہا ہے۔ اور "اللہ کے بارے میں" دھوکا دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ کچھ لوگوں کو تو یہ باور کرائے کہ خدا سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں کو اس غلط فہمی میں ڈالے کہ خدا ایک دفعہ بس دنیا کو حرکت دے کر الگ جا بیٹھا ہے، اب اسے اپنی بنائی ہوئی اِس کائنات سے عملاً کوئی سروکار نہیں ہے۔ اور کچھ لوگوں کو یہ چکمہ دے کہ خدا کائنات کا انتظام تو بے شک کر رہا ہے، مگر اس نے انسانوں کی رہنمائی کرنے کا کوئی ذمہ نہیں لیا ہے، اس لیے یہ وحی و رسالت محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ اور کچھ لوگوں کو یہ جھوٹے بھروسے دلائے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، تم خواہ کتنے ہی گناہ کرو، وہ بخش دے گا، اور اس کے کچھ پیارے ایسے ہیں کہ ان کا دامن تھام لو تو بیڑا پار ہے۔

۱۵ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گمراہی کا) جس کے لیے اُس کا بُرا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو؟ ۱۶ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔ پس (اے نبی) خواہ مخواہ تمہاری جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلے

۱۳ یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی اِس دعوت کو ماننے سے انکار کر دیں گے۔

۱۴ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا اور جو نیک عمل انہوں نے کیے ہونگے ان کا محض برابر سرابر ہی اجر دیکر نہ رہ جائے گا بلکہ انہیں بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

۱۵ اوپر کے دو پیراگراف عوام الناس کو خطاب کرکے ارشاد ہوئے تھے۔ اب اس پیراگراف میں اُن علمبرداران ضلالت کا ذکر ہو رہا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

۱۶ یعنی ایک بگڑا ہوا آدمی تو وہ ہوتا ہے جو بُرا کام تو کرتا ہے مگر یہ جانتا اور مانتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے۔ ایسا شخص سمجھانے سے بھی درست ہو سکتا ہے اور کبھی خود اس کا اپنا ضمیر بھی ملامت کرکے اسے راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی صرف عادتیں ہی بگڑی ہیں۔ ذہن نہیں بگڑا۔ لیکن ایک دوسرا شخص ایسا ہوتا ہے جس کا ذہن بگڑ چکا ہوتا ہے، جس میں بُرے اور بھلے کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ جس کے لیے گناہ کی زندگی ایک مرغوب اور تابناک زندگی ہوتی ہے۔ جو نیکی سے گھِن کھاتا ہے اور بدی کو عین تہذیب و ثقافت سمجھتا ہے، جو صلاح و تقویٰ کو دقیانوسیت اور فسق و فجور کو ترقی پسندی خیال کرتا ہے، جس کی نگاہ میں ہدایت گمراہی اور گمراہی سراسر ہدایت بن جاتی ہے۔ ایسے شخص پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی وہ نہ خود اپنی حماقتوں پر متنبہ ہوتا ہے اور نہ کسی سمجھانے والے کی بات سُن کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی کے پیچھے پڑنا لاحاصل ہے۔ اسے ہدایت دینے کی فکر میں اپنی جان گھلانے کے بجائے داعیِ حق کو اُن لوگوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے جن کے ضمیر میں ابھی زندگی باقی ہو اور جنہوں نے اپنے دل کے دروازے حق کی آواز کے لیے بند نہ کر لیے ہوں۔

۱۷ پہلے فقرے اور اس فقرے کے درمیان یہ ارشاد کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے

جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس کو خوب جانتا ہے[۱۵]۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے،

اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے" صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ جو لوگ اس حد تک اپنے ذہن کو بگاڑ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت کی توفیق سے محروم کر دیتا ہے اور انہی راہوں میں بھٹکنے کے لیے اُنہیں چھوڑ دیتا ہے جن میں بھٹکتے رہنے پر وہ خود مُصر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت سمجھا کر اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لے آنا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا اُن کے معاملہ میں صبر کر لو اور جس طرح اللہ کو ان کی پروا نہیں رہی ہے تم بھی ان کے حال پر غم کھانا چھوڑ دو۔

اس مقام پر دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں۔ ایک یہ کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ عامۃ الناس نہیں تھے بلکہ مکّہ معظمہ کے وہ سردار تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ناکام کرنے کے لیے ہر جھوٹ، ہر فریب اور ہر مکر سے کام لے رہے تھے۔ یہ لوگ درحقیقت حضورؐ کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ خوب جانتے تھے کہ آپ کس چیز کی طرف بلا رہے ہیں اور آپ کے مقابلے میں وہ خود کن جہالتوں اور اخلاقی خرابیوں کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ سب کچھ جانتے اور سمجھ لینے کے بعد ٹھنڈے دل سے ان کا فیصلہ یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو نہیں چلنے دینا ہے۔ اور اس غرض کے لیے انہیں کوئی اوچھے سے اوچھا ہتھیار اور کوئی ذلیل سے ذلیل ہتھکنڈا استعمال کرنے میں باک نہ تھا۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر اور آپس میں مشورے کر کر کے آئے دن ایک نیا جھوٹ تصنیف کریں اور اسے کسی شخص کے خلاف پھیلائیں وہ دنیا بھر کو دھوکا دے سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو تو وہ جھوٹا جانتے ہیں اور خود اُن سے تو یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہوتی کہ جس شخص پر انہوں نے ایک الزام لگایا ہے وہ اُس سے بَری ہے۔ پھر اگر وہ شخص جس کے خلاف یہ جھوٹے ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہوں، ان کے جواب میں کبھی صداقت و راستبازی سے ہٹ کر کوئی بات نہ کرے تو ان ظالموں سے یہ بات بھی کبھی چھپی نہیں رہ سکتی کہ ان کا مدِّ مقابل ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔ اس پر بھی جن لوگوں کو اپنے کرتوتوں پر ذرا شرم نہ آئے اور وہ سچائی کا مقابلہ مسلسل جھوٹ سے کرتے ہی چلے جائیں ان کی یہ روش خود ہی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ اللہ کی پھٹکار ان پر پڑ چکی ہے اور ان میں بُرے بھلے کی کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔

پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر ہم اسے ایک اُجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اسی زمین کو جِلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہوگا۔[۱۹] جو کوئی عزت چاہتا ہو اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔[۲۰]

دوسری بات جسے اس موقع پر سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر محض اپنے رسولِ پاک کو اُن کے معاملے کی اصل حقیقت سمجھانا ہوتا تو وہ خفیہ طور پر صرف آپ ہی کو سمجھا سکتا تھا۔ اس غرض کے لیے وحیِ جلی میں علی الاعلان اُس کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ قرآن مجید میں اسے بیان کرنے اور دنیا بھر کو سنا دینے کا مقصود دراصل عوام الناس کو متنبہ کرنا تھا کہ جن لیڈروں اور پیشواؤں کے پیچھے تم آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہو وہ کیسے بگڑے ہوئے ذہن کے لوگ ہیں اور اُن کی بیہودہ حرکات کس طرح منہ سے پکار پکار کر بتا رہی ہیں کہ اُن پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔

۱۸؎ اس فقرے میں آپ سے آپ یہ دھمکی پوشیدہ ہے کہ ایک وقت آئیگا جب اللہ تعالیٰ انہیں اِن کرتوتوں کی سزا دیگا۔ کسی حاکم کا کسی مجرم کے متعلق یہ کہنا کہ میں اس کی حرکتوں سے خوب واقف ہوں، صرف یہی معنی نہیں دیتا کہ حاکم کو اس کی حرکتوں کا علم ہے، بلکہ اس میں یہ تنبیہ لازماً مضمر ہوتی ہے کہ میں اس کی خبر لے کر رہوں گا۔

۱۹؎ یعنی یہ نادان لوگ آخرت کو بعید از امکان سمجھتے ہیں اور اسی لیے اپنی جگہ اِس خیال میں مگن ہیں کہ دنیا میں یہ خواہ کچھ کرتے رہیں بہرحال وہ وقت کبھی آنا نہیں ہے جب انہیں جوابدہی کے لیے خدا کے حضور حاضر ہونا پڑیگا۔ لیکن یہ محض ایک خیالِ خام ہے جس میں یہ مبتلا ہیں۔ قیامت کے روز تمام اگلے پچھلے مرے ہوئے انسان اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر بالکل اُسی طرح یکایک جی اٹھیں گے جس طرح ایک بارش ہوتے ہی سوئی پڑی ہوئی زمین یکایک لہلہا اٹھتی ہے اور مدتوں کی مری ہوئی جڑیں سرسبز و شاداب ہو کر زمین کی تہوں میں سے سر نکالنا شروع کر دیتی ہیں۔

۲۰؎ یہ بات ملحوظ رہے کہ قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں جو کچھ بھی کر رہے تھے اپنی عزت اور اپنے وقار کی خاطر کر رہے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چل گئی

اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے، اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے[۱۲] رہے وہ لوگ جو بیہودہ چال بازیاں کرتے ہیں[۱۳] اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور اُن کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے۔

اللہ[۱۴] نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ[۱۵] سے، پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد اور عورت)۔ کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔

تو ہماری بڑائی ختم ہو جائے گی، ہمارا اثر و رسوخ مٹ جائیگا اور ہماری جو عزت سارے عرب میں بنی ہوئی ہے وہ خاک میں مل جائے گی۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا سے کفر و بغاوت کر کے جو عزت تم نے بنا رکھی ہے، یہ تو ایک جھوٹی عزت ہے جس کے لیے خاک ہی میں ملنا مقدر ہے۔ حقیقی عزت اور پائیدار عزت، جو دنیا سے لیکر عقبیٰ تک کبھی ذلت آشنا نہیں ہو سکتی، صرف خدا کی بندگی میں ہی میسر آسکتی ہے اُس کے ہو جاؤ گے تو وہ تمہیں مل جائے گی۔ اور اُس سے مُنہ موڑو گے تو ذلیل و خوار ہو کر رہو گے۔

[۱۲] یہ ہے عزت حاصل کرنے کا اصل ذریعہ۔ اللہ کے ہاں جھوٹے اور خبیث اور مفسدانہ اقوال کو کبھی عروج نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں تو صرف وہ قول عروج پاتا ہے جو سچا ہو، پاکیزہ ہو، حقیقت پر مبنی ہو، اور جس میں نیک نیتی کے ساتھ ایک صالح عقیدے اور ایک صحیح طرزِ فکر کی ترجمانی کی گئی ہو۔ پھر جو چیز ایک پاکیزہ کلمے کو عروج کی طرف لے جاتی ہے وہ قول کے مطابق عمل ہے۔ جہاں قول بڑا پاکیزہ ہو مگر عمل اس کے خلاف ہو وہاں قول کی پاکیزگی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ محض زبان کے پھاگ اُڑانے سے کوئی کلمہ بلند نہیں ہوتا۔ اُسے عروج پر پہنچانے کے لیے عملِ صالح کا زور درکار ہوتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید قولِ صالح اور عملِ صالح کو لازم و ملزوم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کوئی عمل محض اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پشت پر عقیدۂ صالحہ نہ ہو۔ اور کوئی عقیدۂ صالحہ ایسی حالت میں معتبر نہیں ہو سکتا جب تک کہ آدمی کا عمل اس کی تائید و تصدیق نہ کر رہا ہو۔ ایک شخص اگر زبان سے کہتا ہے کہ میں صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کو معبود مانتا ہوں، مگر عملاً وہ غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے قول کی تکذیب کر دیتا ہے۔ ایک شخص اگر

کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے ۲۵ اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے ۲۶ اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں ہیں ۲۷

زبان سے کہتا ہے کہ میں شراب کو حرام مانتا ہوں، مگر عملاً وہ شراب پیتا ہے تو اس کا محض قول نہ خلق کی نگاہ میں مقبول ہو سکتا ہے نہ خدا کے ہاں اسے کوئی قبولیت نصیب ہو سکتی ہے۔

۲۲ یعنی باطل اور خبیث کلمے لیکر اُٹھتے ہیں، اُن کو چالاکیوں سے، فریب کاریوں سے اور نظر فریب استدلالوں سے فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کے مقابلے میں کلمۂ حق کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی بُری سے بُری تدبیر استعمال کرنے سے باز نہیں رہتے۔

۲۳ یہاں سے پھر روئے سخن عوام الناس کی طرف پھرتا ہے۔

۲۴ یعنی انسان کی آفرینش پہلے براہِ راست مٹی سے کی گئی، پھر اس کی نسل نطفے سے چلائی گئی۔

۲۵ یعنی جو شخص بھی دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کے متعلق پہلے ہی یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ اسے دنیا میں کتنی عمر پانی ہے۔ کسی کی عمر دراز ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، اور چھوٹی ہوتی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے فیصلے کی بنا پر ہوتی ہے۔ بعض نادان لوگ اس کے جواب میں یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ پہلے نوزائیدہ بچوں کی موتیں بکثرت واقع ہوتی تھیں اور اب علمِ طب کی ترقی نے ان اموات کو روک دیا ہے۔ اور پہلے لوگ کم عمر پاتے تھے، اب وسائلِ علاج بڑھ جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عمریں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ دلیل قرآن مجید کے اِس بیان کی تردید میں صرف اُس وقت پیش کی جا سکتی تھی جبکہ کسی ذریعہ سے ہم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے تو فلاں شخص کی عمر مثلاً دو سال لکھی تھی اور ہمارے طبی وسائل نے اُس میں ایک دن کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح کا کوئی علم اگر کسی کے پاس نہیں ہے تو وہ کسی معقول بنیاد پر قرآن کے اِس ارشاد کا معارضہ نہیں کر سکتا۔ محض یہ بات کہ اعداد و شمار کی رُو سے اب بچوں کی شرحِ اموات گھٹ گئی ہے، یا پہلے کے مقابلہ میں اب لوگ زیادہ عمر پا رہے ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ انسان اب اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو بدلنے پر قادر ہو گیا ہے۔ آخر اس میں کیا عقلی استبعاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں پیدا ہونے والے انسانوں کی عمریں مختلف طور پر مقرر فرمائی ہوں

ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے پینے میں خوشگوار، اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے۔
مگر دونوں سے تم تروتازہ گوشت حاصل کرتے ہو،[۲۸] پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو،[۲۹] اور
اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اُس کا سینہ چیرتی چلی جا رہی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور
اس کے شکر گزار بنو۔ وہ دن کے اندر رات کو اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے[۳۰]
چاند اور سورج کو اُس نے مسخر کر رکھا ہے،[۳۱] یہ سب کچھ ایک وقتِ مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ وہی اللہ
(جس کے یہ سارے کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اُسے چھوڑ کر جن دوسروں کو
تم پکارتے ہو وہ ایک پرِکاہ[۳۲] کے مالک بھی نہیں ہیں۔ انہیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے اور

اور یہ بھی اللہ عزوجل ہی کا فیصلہ ہو کہ فلاں زمانے میں انسان کو فلاں امراض کے علاج کی قدرت عطا کی
جائیگی اور فلاں دور میں انسان کو بقائے حیات کے فلاں ذرائع بخشے جائیں گے۔

۲۶ یعنی اتنی بے شمار مخلوق کے بارے میں اتنا تفصیلی علم اور فرد فرد کے بارے میں اتنے مفصل
احکام اور فیصلے کرنا اللہ کے لیے کوئی دشوار کام نہیں ہے۔

۲۷ یعنی ایک وہ ذخیرہ جو سمندروں میں ہے۔ دوسرا وہ ذخیرہ جو دریاؤں، چشموں اور جھیلوں
میں ہے۔

۲۸ یعنی آبی جانوروں کا گوشت۔

۲۹ یعنی موتی، مونگے، اور بعض دریاؤں سے ہیرے اور سونا۔

۳۰ یعنی دن کی روشنی آہستہ آہستہ گھٹنی شروع ہوتی ہے اور رات کی تاریکی بڑھتے بڑھتے آخرکار
پوری طرح چھا جاتی ہے۔ اسی طرح رات کے آخر میں پہلے افق پر ہلکی سی روشنی نمودار ہوتی ہے اور پھر
رفتہ رفتہ روزِ روشن نکل آتا ہے۔

۳۱ ایک ضابطے کا پابند بنا رکھا ہے۔

۳۲ اصل میں لفظ قِطْمِیر استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ پتلی سی جھلی ہے جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتی
ہے لیکن اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ مشرکین کے معبود کسی حقیر سے حقیر چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اسی لیے

سُن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے۔[۳۳] اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔[۳۴] حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمہیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔[۳۵] ع

ہم نے لفظی ترجمہ چھوڑ کر مرادی ترجمہ کیا ہے۔

۳۳ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمہاری دعا کے جواب میں پکار کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہاری دعا قبول کی گئی یا نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہاری درخواستوں پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ایک شخص اگر اپنی درخواست کسی ایسے شخص کے پاس بھیج دیتا ہے جو حاکم نہیں ہے تو اس کی درخواست رائگاں جاتی ہے، کیونکہ وہ جس کے پاس بھیجی گئی ہے اس کے ہاتھ میں سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے، نہ رد کرنے کا اختیار اور نہ قبول کرنے کا اختیار۔ البتہ اگر وہی درخواست اُس ہستی کے پاس بھیجی جائے جو واقعی حاکم ہو، تو اس پر لازماً کوئی نہ کوئی کارروائی ہوگی، قطع نظر اس سے کہ وہ قبول کرنے کی شکل میں ہو یا رد کرنے کی شکل میں۔

۳۴ یعنی وہ صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے ان سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ہم خدا کے شریک ہیں، تم ہماری عبادت کیا کرو۔ بلکہ ہمیں یہ خبر بھی نہ تھی کہ یہ ہم کو اللہ رب العالمین کا شریک ٹھیرا رہے ہیں اور ہم سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کی کوئی دعا ہمیں نہیں پہنچی اور ان کی کسی نذر و نیاز کی ہم تک رسائی نہیں ہوئی۔

۳۵ خبردار سے مراد اللہ تعالیٰ خود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرا کوئی شخص تو زیادہ سے زیادہ عقلی استدلال سے شرک کی تردید اور مشرکین کے معبودوں کی بے اختیاری بیان کرے گا۔ مگر ہم حقیقتِ حال سے براہِ راست باخبر ہیں۔ ہم علم کی بنا پر تمہیں بتا رہے ہیں کہ لوگوں نے جن جن کو بھی ہماری خدائی میں با اختیار ٹھیرا رکھا ہے وہ سب بے اختیار ہیں۔ ان کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے جس سے وہ کسی کا کوئی کام بنا سکیں یا بگاڑ سکیں۔ اور ہم براہ راست یہ جانتے ہیں کہ قیامت کے روز مشرکین کے یہ معبود خود ان کے شرک کی تردید کریں گے۔

اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں

— جناب محمد نجات اللہ صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ لکچرر شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ —

اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داریاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، اپنے شہریوں کی اسلامی تعلیم و تربیت، دفاع، دنیا کو حق کی طرف دعوت اور اس سلسلہ میں اگر ضرورت پڑے تو جہاد، اور ملک میں عدل و قسط اور امن و امان کے قیام کے ذریعہ جان و مال کا تحفظ کرنا ہے۔ یہاں ان ذمہ داریوں سے بحث نہیں۔ اس مقالہ میں ہم اسلامی ریاست کی ان ذمہ داریوں کا قدرے تفصیلی جائزہ لیں گے جو خالصتہً معاشی ہیں۔ ان ذمہ داریوں میں کفالتِ عامہ، معاشی ترقی کا اہتمام اور تقسیمِ دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا شامل ہے۔

۱۔ کفالتِ عامہ

کفالتِ عامہ سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام کی حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریاتِ[1] زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے، یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔

---

[1] ہر وہ ضرورت بنیادی ضرورت ہے جس پر کسی انسان کی زندگی کی بقا کا انحصار ہو۔ شریعت کی کسی نص میں ان ضرورتوں کی صراحت نہیں کی گئی ہے مگر خود یہ اصول نصوص سے ثابت ہے جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔ اس فقرہ میں جن چار ضرورتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی نوعیت یہ ہے کہ ان کی عدمِ تکمیل آدمی کی جان کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔ متعلقہ نصوص اور ان کے مطابق عمل کی نظیروں سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم ان ضرورتوں کی تکمیل اس اصول کا لازمی تقاضا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر فرد کو ان ضروریات کی تکمیل کرنے والی اشیاء اور خدمات کی مطلوبہ یا ضروری مقداریں بہم پہنچاتی رہے، بلالحاظ اس کے کہ وہ خود اپنے مال سے، یا اپنی محنت کے ذریعہ کسبِ مال کر کے ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، عام حالات میں عام افراد ان ضروریات کو خود اپنے بل بوتے پر پورا کرتے رہیں گے، بقدرِ ضرورت مال نہ حاصل کر سکنے والے افراد کو اپنے خاندان یا عام افرادِ اجتماع سے اتنی مدد مل سکے گی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو عارضی بے روزگاری، مرض، بڑھاپے یا کسی حادثہ کے سبب معذور ہو جانے کی حالت میں کارخانہ یا متعلقہ صنعت سے اتنا امدادی وظیفہ دلانے کا اصول بنایا جا سکتا ہے جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ سماجی تحفظ

کے ان انتظامات کو سامنے رکھتے ہوئے اس اصول کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد ان انتظامات کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو بالآخر اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ فرد ان وسائلِ حیات سے محروم نہ رہے جو ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اور بلا تاخیر اجتماعی خزانہ سے بقدرِ ضرورت مال حاصل کر سکیں، اور دار الاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا، ننگا، بے ٹھکانا اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول واضح فرما دیا ہے کہ اصحاب امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں، جیسا کہ ذیل کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

حدثنا سلیمٰن بن عبد الرحمٰن الدمشقی نا یحیٰی بن حمزۃ قال حدثنی ابن ابی مریم ان القاسم بن مخیمرۃ اخبرہ ان ابا مریم الازدی اخبرہ قال: دخلت علی معاویۃ فقال ما انعمنا بك ابا فلانٍ۔ وھی کلمۃ

ہم سے سلیمان بن عبد الرحمٰن دمشقی نے بروایت یحییٰ بن حمزہ یہ حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ مجھ سے ابن ابی مریم نے حدیث بیان کی ہے کہ قاسم بن مخیمرہ نے انھیں خبر دی ہے کہ ابو مریم الازدی نے ان سے کہا ہے کہ میں معاویہ کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا:

تقولها العرب ـ فقلت حديثاً سمعته اخبرك به ـ سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلّم يقول: من ولّاه الله عز وجل شيئاً من امور المسلمين فاحتجب دون حاجتهم وخلّتهم وفقرهما احتجب الله تعالىٰ عنه دون حاجته وخلّته وفقره۔[1]

ابو فلاں: کیسے تشریف لائے۔ میں نے کہا آپ کو ایک حدیث سنانے آیا ہوں جسے میں نے سنا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جسے اللہ عز وجل نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔"

قال: فجعل رجلاً على حوائج الناس[1]

راوی کہتا ہے کہ معاویہ نے (یہ سن کر) ایک آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے) پر مامور کر دیا۔

حدثنا احمد بن منیع ثنا اسمٰعیل بن ابراهیم قال ثنی علی بن الحکم ثنی ابوالحسن قال قال عمرو بن مرة لمعاویة انی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: ما من امامٍ يغلق بابه دون ذوى الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلّته وحاجته و مسكنته فجعل معاويه رجلاً على حوائج الناس[2]

ہم سے احمد بن منیع نے حدیث بیان کی ہے کہ ہم سے اسمٰعیل بن ابراہیم نے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ مجھ سے علی بن الحکم نے حدیث بیان کی ہے کہ مجھ سے ابوالحسن نے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ: عمرو بن مرہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: "جو امام ضرورتمندوں، فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر دیتا ہے اللہ اس کی ضروریات پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔" (یہ سنکر) معاویہ نے ایک آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے) پر مامور کر دیا۔

---

[1] ابو داؤد ـ کتاب الخراج والفئ والامارة ـ باب فیما یلزم الامام من امر الرعیة والاحتجاب عنہم۔

[2] ترمذی ـ کتاب الاحکام ـ باب ماجاء فی امام الرعیة۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اگر صاحب امر ضرورت مندا فراد کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضگی مول لے گا۔ یہ وعید اس بات کے لیے کافی ہے کہ تکمیلِ ضروریات کو اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا جائے یہی وجہ ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو فرمانِ نبویؐ کے ذریعہ ان کی ذمّہ داری یاد دلائی گئی تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ اس کو پورا کرنے کا اہتمام کریں۔

اسلامی ریاست کی اس ذمّہ داری کی اہمیت کا اندازہ خلافت کی اس تعریف سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور جسے سُن کر کعب احبار رضی اللہ عنہ نے اس کی تصویب فرمائی ہے۔

عن سلمان قال: ان الخلیفۃ ھو الذی یقضی بکتاب اللہ ویشفق علی الرعیۃ شفقۃ الرجل علی اھلہ فقال کعب الاحبار۔ صدق[۱]	سلمان (فارسی) نے کہا "خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے" یہ سُن کر کعب احبار نے کہا "سچ کہا"

رعایا کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا اہتمام در اصل اس خیر خواہی کے اندر شامل ہے جو صاحب امر پر لازم قرار دی گئی ہے۔ جو صاحبِ امر رعایا کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتے اس کا اُخروی انجام بُرا ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"ما من عبدٍ یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم یحطھا بنصیحۃ لم یجد رائحۃ الجنۃ[۲]	جس بندہ کو اللہ نے کسی رعایا کا حکمراں بنایا اور اُس نے اُس کے ساتھ پوری طرح خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پاسکے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ بات خیر خواہی کے اوّلین تقاضوں میں سے ہے کہ جن ضروریات کی عدم تکمیل

[۱] ابو عبید۔ کتاب الاموال طبع قاہرہ ۱۳۵۳ھ صفحہ ۶ نمبر ۱۲
[۲] بخاری۔ کتاب الاحکام۔ باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح

سے آدمی کی جان ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو ان کو پورا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

شریعت نے اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا ولی (سرپرست) قرار دیا ہے۔ اس سرپرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اللہ ورسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہ۔[1]	جس کا سرپرست کوئی نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔
السلطان ولی من لا ولی لہ[2]	جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے

یہ بات کہ یہ سرپرستی صرف "نکاح" کے معاملہ تک محدود نہیں بلکہ ایک عمومی سرپرستی ہے جس میں رعایا کی ضروریات کی تکمیل بدرجۂ اولیٰ شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس خط سے صاف ظاہر ہے جو آپ نے ایک نومسلم قبیلہ کے سردار زرعہ بن ذی یزن کے نام لکھا تھا، آپ سردار کے توسط سے اس کے قبیلہ "حمیر" کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

وانی امرکم یا حمیر خیرًا، فلا تخونوا، ولا تخاذلوا، وان رسول اللہ مولیٰ غنیکم وفقیرکم وان الصدقۃ لا تحل لمحمد ولا لاھلہ، انما ھی زکاۃ تزکون بھا لفقراء المؤمنین[3]۔۔۔	اہل حمیر میں تمہیں بھلی روش اختیار کیے رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ نہ خیانت کرنا اور نہ مخالفانہ روش اختیار کرنا۔ اللہ کا رسول تمہارے امیر اور غریب تمام لوگوں کا سرپرست ہے۔ صدقہ کا مال محمدؐ یا اس کے گھر والوں کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ یہ زکاۃ ہے جسے تم (اپنی پاکیزگی کے لیے) غریب مسلمانوں کے لیے نکالتے ہو۔

اس خط میں اہل حمیر کو یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے اُن کے مال کا جو حصّہ بطورِ زکوٰۃ وصول کیا جائے گا

---

[1] ترمذی، ابواب الفرائض باب ماجاء فی میراث الخال

[2] ایضاً ابواب النکاح۔ باب ماجاء لا نکاح الا بولی اور ابوداؤد کتاب النکاح۔ باب الولی

[3] ابوعبید۔ کتاب الاموال۔ صفحہ ۲۰۲ نمبر ۵۱۶

وہ صدرِ ریاست کے ذاتی مصرف میں نہیں آئے گا بلکہ ضرورت مند مسلمانوں کو دیا جائے گا ان کو اطاعت ترک کرکے سرکشی کی روش اختیار کرنے یا امانت ترک کرکے ادائے عشر و زکوٰۃ میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ جو فرد بھی ضرورت یا مصیبت سے پریشان ہوگا، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، اللہ کا رسول اس کو سہارا دینے کے لیے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں "رسول اللہ" سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حیثیت پیشِ نظر ہے جو اسلامی ریاست کے صدر کے طور پر آپ کو حاصل تھی۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو ایک خط لکھا تھا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "اللہ و رسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہ" کا حوالہ دے کر ریاست کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا تھا[۲]

اس "سرپرستی" میں بنیادی ضروریات کے علاوہ، بشرطِ گنجائش، افراد کی دوسری ضروریات کی تکمیل بھی داخل ہو جاتی ہے۔ فتوحات کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرما دیا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وفات پا جائیں ان کے قرضے اسلامی ریاست کے خزانے سے ادا کیے جائیں گے۔ فرمایا:-

انا اولی بالمومنین من انفسھم فمن توفی وعلیہ دین فعلی قضاءہ[۱]	میں مسلمانوں سے اُن کے اپنے افراد کی بہ نسبت زیادہ قریب ہوں۔ پس جو مقروض وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔
.... فلما فتح اللہ علیہ الفتوح قال: "انا اولی بالمومنین من انفسھم فمن توفی من المومنین فترک	.... پھر جب اللہ نے آپ پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو آپ نے فرمایا: "میں مسلمانوں سے اُن کے اپنے افراد کی بہ نسبت زیادہ قریب ہوں۔ لہٰذا جو مسلمان

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ ترمذی۔ ابواب الفرائض۔ باب ما جاء فی میراث الخال

[۲] ابو عبیدہ۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۲۰

دیناً فعلیّ قضاءه ومن ترك مالاً فلورثته[1]

قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کیلئے ہوگا

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قرض کے علاوہ دوسری ذمہ داریوں مثلاً بے سہارا اہل و اولاد کی کفالت کے سلسلہ میں بھی یہی اعلان فرمایا۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من ترك مالاً فلاهله ومن ترك ضياعاً فاليّ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داریاں میرے سر ہوں گی۔

هذا حديث حسن صحيح . . .

(امام ترمذی فرماتے ہیں) یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

. . . ومعنی قوله ترك ضياعاً يعنی ضائعاً ليس له شیءٌ، فاليّ، يقول انا اعوله وانفق عليه[2]

. . . ترک ضیاعاً کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس حال میں چھوڑ جائے کہ اس (بچے وغیرہ) کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ فالیّ کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں اس کی کفالت کرونگا اور اس پر مال خرچ کرونگا

اسی مفہوم کی ایک حدیث ابوعبید نے حضرت مقدام بن معدی کرب سے روایت کی ہے جس سے بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من ترك مالاً فلورثته ومن ترك كلّاً فالی الله وربما قال: فالی الله ورسوله

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو متوفی مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے اور جو ذمہ داریاں چھوڑ کر مرے وہ اللہ کے ذمہ ہیں اور کبھی یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب النفقات۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم من ترک کلاً او ضیاعاً فالیّ۔ یہی حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ مسلم، ترمذی اور نسائی میں بھی آئی ہے۔

[2] ترمذی۔ ابواب الفرائض۔ باب ما جاء من ترک مالا فلورثتہ۔

قال ابو عبید : الکلّ عندنا کل عیّلٍ، والذریہ منھم[1] — ابو عبید کہتا ہے کہ ہمارے نزدیک "کلّ" میں وہ تمام افراد شامل ہیں جنکی کفالت متوفی کے ذمّہ ہو اور بچے بھی اسمیں شامل ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو افراد اسلامی ریاست کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے ان کو اپنی ان وسیع ذمّہ داریوں کا پورا شعور تھا۔ اس حقیقت پر خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی ذمّہ داریاں گناتے ہوئے ایک عام خطبہ میں یہ فرمایا تھا :۔

ایھا الناس ان اللہ قد کلّفنی ان اصرف عنہ الدعاء[2] — لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار قرار دیا ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں۔

اس ارشاد کی تشریح کرتے ہوئے مشہور شافعی فقیہ ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام (م ۶۶۰ ھ) لکھتے ہیں :

"اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے، اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری کرے تاکہ ان کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ ربّ العالمین سے ان کی تکمیل کے طالب ہوں۔ حکمرانوں پر مسلمانوں کے جملہ حقوق کے بیان میں یہ جملہ کتنا جامع اور واضح ہے[3]"

اسی اصول کا اعلان حضرت عمرؓ نے اس وقت بھی فرمایا تھا جب آپ سعد بن مالک الزہریؓ کو عراق کا امیر بنا کر بھیج رہے تھے۔

انی بینکم و بین اللہ ولیس بینی و بینہ احدٌ، و ان اللہ — تمہارے اور اللہ کے درمیان میں ہوں اور میرے اور اللہ کے درمیان کوئی بھی نہیں۔ اللہ نے میرے لیے ضروری قرار

---

[1] ابو عبید، کتاب الاموال صفحہ ۲۳۷

[2] ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسّلام : قواعد الاحکام فی مصالح الانام۔ مکتبۂ حسینیہ مصر۔ طبع ۱۹۳۴ء جلد اوّل صفحہ ۱۴۸ [3] ایضاً

قد الزمني دفع الدعاء عنه فانهوا شكاتكم الينا فمن لم يستطع فالى من يبلغناها ناخذ له الحق غير متعتع[1]

دیا ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں لہٰذا تم لوگ اپنی شکایتیں میرے پاس بھیجو۔ جو خود ایسا نہ کر سکے وہ کسی ایسے آدمی تک بات پہنچا دے جو اسے مجھ تک پہنچا سکے تو ہم اس کا حق بغیر کسی تذبذب کے وصول کرا دیں گے۔

عوام کی معاشی ضروریات کی تکمیل کا امیر المومنین کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس خطبہ سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام کے سامنے دیا تھا۔ اس میں آپ نے فرمایا۔

انی حریص علی ان لا اری حاجة الا سددتها ما اتسع بعضنا بعضا فاذا عجز ذلك عنا تآسینا فی عیشنا حتی نستوی فی الكفاف ولوددت انكم علمتم من نفسی مثل الذی وقع فیها لكم، ولست معلمكم الا بالعمل. انی واللہ لست بملك فاستعبدكم و لكنی عبد اللہ عرض علیّ الامانة فان ابیتها ورددتها علیكم واتبعتكم حتی تشبعوا فی بیوتكم و ترووا سعدت بكم وان انا حملتها واستتبعتكم الی بیتی شقیت

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں اسے پورا کر دوں، جب تک کہ ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں جب ہمارے اندر اتنی گنجائش نہ رہ جائے تو ہم باہمی امداد کے ذریعہ گزر اوقات کریں گے، یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے۔ لیکن میں یہ بات تمہیں عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں کہ تم کو غلام بنا کر رکھوں بلکہ ایک بندۂ خدا ہوں (حکمرانی کی) یہ امانت میرے سپرد کی گئی اب اگر میں اسے اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ تمہاری چیز ہے تمہاری طرف واپس کر دوں اور تمہارے پیچھے پیچھے (خدمت کے لیے) چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں

---

[1] طبری - تاریخ ص ۲۲۲ (حوادث ۱۴ھ)، ابن کثیر: البدایہ والنہایہ جلد ۷، صفحہ ۴۶

یکمشتہ

ہیں سیر ہو کر کھا پی سکو تو تمہارے ذریعہ میں نیک بخت بن جاؤنگا اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے پہننے اور اپنے گھر آنے پر مجبور کروں تو تمہارے ذریعہ میرا انجام خراب ہوگا۔

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی حکمرانوں نے اسلامی ہدایات کو اپنا رہنما بنایا، اُس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اس کا اعلان کیا۔

جب عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کی گرانباری محسوس کرکے رونے لگے۔

قالت فاطمة امراته: دخلت عليه وهو في مصلاه ودموعه تجري على لحيته فقلت أحدث شيءٌ فقال: اني تقلدت امر امة محمد فتفكرت في الفقير الجائع والمريض الضائع، والغازي، والمظلوم المقهور، والغريب الاسير والشيخ الكبير وذي العيال الكثير والمال القليل، واشباههم في اقطار الارض فعلمت ان ربي سيسألني عنهم يوم القيامة وان خصمي دونهم محمد صلى الله عليه وسلم

ان کی بیوی فاطمہ کہتی ہیں کہ ایک بار میں آپکے پاس گئی آپ جائے نماز پر تھے اور آنسو ٹپک ٹپک کر داڑھی کو تر کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہوگئی۔ آپ نے فرمایا میں نے پوری اُمّتِ محمدیہ کی ذمہ داری لے لی ہے لہٰذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار قیدیوں، بہت بوڑھے افراد اور ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بکثرت اہل و عیال والے ہیں مگر مالدار نہیں ہیں، اور مختلف علاقوں میں اسی قسم کے دوسرے افراد کے بارے میں متفکر تھا مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے دن اللہ مجھ سے ان سب کے بارے میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلہ میں ان لوگوں کے وکیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہونگے

لہ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ جلد ، صفحہ ۲۰۶، اور طبری صفحہ ۲۳۶۸ حوادث ۱۰۱ھ

الی اللہ فخشیت ان لا تثبت حجتی عند الخصومۃ فرحمت نفسی فبکیت[1]

مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات نہ ثابت ہو سکے گی اور میں اپنے اوپر ترس کھا کر رونے لگا۔

نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا، بلکہ آپ نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ:

وما احد منکم تبلغنی حاجتہ الا حرصت ان اسد من حاجتہ ما قدرت علیہ[2]

تم میں سے جس کسی کی بھی کسی ضرورت کا علم مجھے ہوگا اس کی ضرورت پوری کرنے میں حتی الامکان پوری کوشش کروں گا۔

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی ریاست کے شہری اپنے حکمرانوں کی اس ذمہ داری سے واقف تھے۔ اور وقت آنے پر ان کو اس ذمہ داری کی ادائیگی کی طرف متوجہ بھی کرتے تھے۔ اوپر ہم نے امیر معاویہ کے عہد کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ذیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔

"عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک زبردست قحط پڑا تو عرب سے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے آپ سے گفتگو کرنے کے لیے ایک آدمی کو منتخب کر لیا اس شخص نے کہا: "اے امیر المومنین ہم ایک شدید ضرورت کے سبب آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سوکھ گئی کیونکہ اب ہڈیاں بھی نہیں میسر آتیں اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس مال کی حیثیت تین میں سے ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یا تو یہ خدا کے لیے ہے، یا بندگان خدا کے لیے، یا آپ کے لیے اگر یہ خدا کے لیے ہے تو خدا کو اس کی کوئی ضرورت نہیں اگر بندگان خدا کے لیے ہے تو اسے

[1] ابن اثیر الکامل جلد ۵ ص ۴۲، نیز ملاحظہ ہو ابو یوسف: کتاب الخراج طبع قاہرہ ۱۳۴۶ھ صفحہ ۱۰

[2] سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکیم تحقیق احمد عبید طبع ۱۳۴۷ھ بحوالہ اشتراکیۃ الاسلام مصنفہ مصطفی السباعی صفحہ ۳۴۹ طبع دمشق ۱۹۶۰ء

ان کو دے دیجیے اور اگر آپ کا ہے تو صدقہ کے طور پر ہمیں دے دیجیے۔ اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا"۔

یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آپ نے فرمایا کہ اس کی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر تم نے کیا ہے اور حکم دے دیا کہ ان لوگوں کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں [۱]

کفالتِ عامہ کے فریضہ کی عملاً انجام دہی کی متعدد مثالیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ملتی ہیں جب آپ شام تشریف لے گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بڑے موثر انداز میں آپ کو یہ بتایا کہ عوام بھوک سے پریشان ہیں۔ آپ نے فوراً مقامی حکام کو حکم دیا کہ ہر مسلمان کے لیے بقدر کفایت غذائی اجناس فراہم کریں [۲]

۱۸ھ کا مشہور قحط جس کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں اس سال کا نام 'عام الرمادہ' پڑ گیا ہے قرن اول کی اسلامی ریاست کے لیے ایک آزمائشی موقع تھا۔ اس موقع پر صدر ریاست سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جس احساس ذمہ داری، چستی اور تندہی، اور حسنِ انتظام کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کیں وہ ہمیشہ مسلمان حکمرانوں کے لیے ایک نمونہ رہے گا۔ اس قحط کی تفصیلی روداد تو تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں اتنا بتانا کافی ہے کہ قحط اتنا شدید تھا کہ نو مہینے تک پورے حجاز میں فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا۔ خشک سالی کے سبب پیداوار نہیں ہوئی تھی اور دیہات کی آبادی کا ایک بڑا حصہ شہروں بالخصوص مدینہ میں آبسا تھا کہ شاید وہاں سدِ رمق کا اہتمام ہو سکے اور فاقہ کشی کی موت سے بچ سکیں۔ باوجود ہر طرح کے اہتمام کے فاقہ کی وجہ سے بکثرت موتیں ہوئیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں غذائی اجناس کی عام تقسیم، اور سرکاری طور پر ہزاروں افراد

---

[۱] امام غزالی: التبر المسبوک فی نصائح الملوک۔ علیٰ ہامش سراج الملوک۔ لابی بکر محمد بن محمد ابن الولید الفہری الطرطوشی المالکی۔ مطبعہ خیریہ۔ مصر ۱۳۰۶ھ صفحہ ۶۱-۶۲

[۲] ابو عبید۔ کتاب الاموال صفحہ ۲۴۶۔ نیز ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴۷، ۲۴۸

کے لیے کھانا پکوا کر دونوں وقت کھلانے کا انتظام کیا۔ دوسرے علاقوں اور شام جیسے دور دراز ممالک سے غلہ، آٹا، چربی، تیل وغیرہ اشیاءِ ضرورت کو اونٹوں کے لمبے لمبے قافلوں پر بار کرا کے منگوایا اور ہزاروں کی تعداد میں مویشی اور اونٹ باہر سے منگوا کر ذبح کرائے۔ پورے قحط زدہ علاقہ میں لوگوں کو اذنِ عام دے دیا کہ ان قافلوں سے ضرورت کے مطابق چیزیں لے لیں۔ آپ نے قحط اور فاقہ کی بلا کا مقابلہ اُس اہتمام کے ساتھ کیا کہ جس طرح بڑی بڑی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ ان انتظامات کی آپ شخصی طور پر نگرانی کرتے تھے اور کام کرتے کرتے آپ کی حالت ایسی ہو گئی کہ بعد میں لوگ یہ کہہ اُٹھے کہ

لولم یرفع اللہ المحل عام الرمادہ لظننّا ان عمر یموت همًّا بامر المسلمین۔	اگر اللہ عام الرمادہ میں قحط نہ دور کر دیتا تو ہمیں اندیشہ تھا کہ عمر مسلمانوں کے اس مسئلہ کی فکر کرتے کرتے مرجائیں گے۔

دن بھر ان کاموں میں مصروف اور پریشان رہتے، پھر راتوں میں رزاقِ مطلق اور رب العالمین کے حضور سجدہ ریز ہو کر دعائیں کرتے، اور خود عام مسلمانوں کی مصیبت میں پوری طرح شریک ہونے کی خاطر گھی اور گوشت کا استعمال ترک کر دینے کے سبب آپ کی صحت خراب ہو گئی اور رنگ سیاہ پڑ گیا۔[1]

کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تصور اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر کوئی جانور بھی بھوک کی وجہ سے مرگیا تو مجھے اندیشہ ہے اللہ تعالیٰ کے حضور مجھے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا!

لو مات جملٌ ضیاعا علی شط الفرات لخشیت ان یسأ لنی اللہ عنہ[2]	اگر شط الفرات میں کوئی اونٹ بے سہارا ہو کر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرےگا

[1] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو محمد ابن سعد: الطبقات الکبریٰ۔ طبع بیروت ۱۹۵۷ء جلد ۳ صفحات ۳۱۰ تا ۳۲۲، طبری تاریخ واقعات ۱۸ھ اور ابن کثیر: البدایہ والنہایہ۔ جلد ۷ صفحہ ۹۰-۹۲

[2] محمد بن سعد۔ بحوالہ بالا صفحہ ۳۰۵، تاریخ طبری طبع بریل (لیدن)، ۱۸۹۳ء صفحہ ۲۷۳۸ (واقعات ۲۳ھ)

لو مات کلب علی شاطی الفرات جوعاً لکان عمر مسئولا عنه یوم القیامة[1]	اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرجائے تو قیامت کے دن عمر سے اس کے بارے میں جواب طلبی ہوگی۔
وکان یقول لو ضاعت شاة بالفرات لخشیت ان اسأل عنها یوم القیامة[2]	آپ فرمایا کرتے تھے اگر فرات کے کنارے کوئی بکری بھی ضائع ہوجائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔

کفالتِ عامّہ اور قیامِ عدل کی ذمہ داریوں کو تمام وکمال سے ادا کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ایک سال تک پوری اسلامی مملکت کا دورہ کرکے حالات کا جائزہ لیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

"اگر میں زندہ رہا انشاءاللہ، تو ایک سال تک اپنی رعایا کے درمیان دورہ کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عوام کی بعض ضروریات ایسی ہیں جن کی خبر مجھ تک نہیں پہنچ پاتی۔ ان کے مقامی حاکم مجھے ان ضروریات سے باخبر نہیں رکھتے اور خود وہ لوگ مجھ تک پہنچ نہیں پاتے۔ میں پہلے شام جاؤں گا اور وہاں دو ماہ ٹھیروں گا۔ پھر الجزیرہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا۔ پھر مصر جاؤں گا اور وہاں بھی دو مہینہ تک رہوں گا۔ پھر بحرین جاؤں گا اور دو مہینہ وہاں رہوں گا، پھر کوفہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا۔ پھر بصرہ جاؤں گا اور دو ماہ وہاں ٹھیروں گا خدا کی قسم یہ سال کتنا اچھا ہوگا"[3]

مگر شہادت نے آپ کو اس پروگرام کے مطابق عمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ خود مدینہ میں آپ اہل حاجت

---

[1] توفیق الرحمٰن، مطبوعہ مصر صفحہ ۴۴ بحوالہ اسلام کا زرعی نظام مصنفہ مولانا محمد تقی امینی صفحہ ۵۸

[2] محمد بن محمد بن احمد القرشی المعروف بابن الاخوة: کتاب معالم القربة فی احکام الحسبة طبع لندن ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۱۶

[3] طبری تاریخ۔ بحوالا بالاصفحہ ۱۸۹۳ (حوادث ۲۳ھ)

کا پتہ لگانے اور اُن کی حاجت روائی کا اہتمام کرنے کے لیے راتوں میں گشت لگایا کرتے تھے[1]

آپ اپنے ماتحت حکام اور والیوں کو بھی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ بصرہ کے والی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جب ایک وفد کے ساتھ آپ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپ نے ان لوگوں کو ہدایت کی کہ

الا واوسعوا الناس فی بیوتھم واطعموا عیالھم[2]	سنو! لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور اُن کے متعلقین کو کھلانے کا سامان کرو۔

کفالتِ عامّہ کی ذمّہ داری صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ غیر مسلم رعایا کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے نگراں کو ہدایت کی تھی کہ ضرورت مند اہلِ ذمّہ کا پتہ لگا کر ان کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔

مرّ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بباب قوم وعلیہ سائل یسأل شیخ کبیر ضریر البصر۔ فضرب عضدہ من خلفہ وقال: من ای اھل الکتاب انت؟ فقال یھودیٌ۔ فقال ما الجاک الی ما اری؟ قال اسأل الجزیۃ والحاجۃ والسن۔ قال فاخذ عمر بیدہ وذھب بہ الی منزلہ فرضخ لہ بشیءٍ من المنزل ثم ارسل الی خازن بیت المال فقال: انظر ھذا وضرباءہ فواللہ انصفناہ ان اکلنا شبیبتہ ثم نخذلہ	عمر بن الخطاب کا گذر کسی کے دروازہ پر ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا، ایک بوڑھا آدمی جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی، آپ نے پیچھے سے اس کے بدن کو ٹھوکا اور پوچھا تم کس مذہب کے اہلِ کتاب ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میں بڑھاپے، ضرورتمندی اور جزیہ کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ راوی کہتا ہے کہ عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گئے اور اپنے گھر سے اسے کچھ دیا پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو بلوایا، اور اُن سے کہا: اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو کیونکہ خدا کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے (جزیہ وصول کرکے)

[1] ایضاً صفحہ ۳۴۴/۲۷ (حوادث ۲۳ھ)
[2] طرطوشی: سراج الملوک بحوالہ بالا۔ صفحہ ۱۰۹

عند الهرم[1] کھائیں اور بڑھاپے میں انھیں بلا سہارا چھوڑ دیں۔

شام کے سفر میں آپ کو راستہ میں کچھ عیسائی ملے جو جذام میں مبتلا تھے۔ آپ نے ان کی معذوری کے پیش نظر ان کے لیے روزینہ جاری کرنے کا حکم دے دیا[2]

غیر مسلم رعایا کی ضروریات کی تکمیل کا یہ اہتمام صرف حضرت عمرؓ کی شفقت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ابتدا ہی سے یہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک اہم اصول تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت خالد بن ولید نے اہلِ حیرہ کے ساتھ جو عیسائی تھے، جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی۔

وجعلت ايما شيخ ضعف عن العمل واصابته آفة من الآفات اوكان غنيًا فافتقر وصار اهل دينه يتصدقون عليه طرحت جزيته وعيل من بيت مال المسلمين وعياله ما اقام بدار الهجرة و دار الاسلام[3]

میں نے ان کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آ پڑے جو پہلے مال دار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور جب تک وہ دار الہجرۃ اور دار الاسلام میں رہے گا اس کے اور اس کے اہل و عیال کے جملہ مصارف مسلمانوں کے بیت المال سے پورے کیے جائیں گے۔

اوپر جو احادیث و آثار نقل کی گئی ہیں ان کا تعلق زیادہ تر غذا و مکان جیسی بہت ہی بنیادی ضروریات سے معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض احادیث میں ادائے قرض کا بھی ذکر آتا ہے، اور سرپرستی (ولایت) کی احادیث کا تعلق ہر طرح کی بنیادی ضروریات سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض دوسری روایات سے غذا و مکان کے علاوہ دوسری ضروریات کی تکمیل کے اہتمام کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں کی تعلیم کے لیے معلم مقرر کیے تھے جن کو بیت المال سے تنخواہ دی جاتی تھی۔

[1] ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۵۰-۱۵۱ [2] بلاذری: فتوح البلدان صفحہ ۱۳۵ [3] ابویوسف: کتاب الخراج صفحہ ۱۴۴

عن ابو ضبیف بن عطاء قال	وضیف بن عطاء سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ہے کہ
ثلاثة كانوا بالمدينة يعلمون الصبيان	مدینہ میں تین آدمی بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اور عمر
وكان عمر بن الخطاب يرزق كل واحد	بن الخطاب ان میں سے ہر ایک کو ۱۵ درہم ماہانہ
منهم خمسة عشر درهمًا كل شهر[۱]	دیا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بیت المال سے مقروض افراد کے قرض ادا کرنے، غیر شادی شدہ غریب افراد کی شادی کے سلسلہ میں مالی امداد دینے کی ہدایت جاری کی تھی[۲] آپ نے بھی دیہات کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے تنخواہ دار معلم مقرر کیے تھے[۳] اور قرآن کا علم حاصل کرنے والوں کے لیے وظیفے مقرر کیے تھے[۴] آپ معذور، مزمن مریضوں اور اندھوں کے لیے خادم فراہم کرتے تھے تاکہ وہ ان کی خدمت کریں[۵] آپ نے کوفہ کے والی کو یہ بھی لکھا تھا کہ بیت المال کے فاضل مال سے ان غریب افراد کو امداد دی جائے جو شادی کرنے کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کے لیے مال کے محتاج ہوں[۶] آپ نے اپنے ایک عامل کو مسافر خانے بنوانے کا حکم دیا تھا جہاں مسافروں کو قیام و طعام مفت فراہم کیا جائے[۷]

ان آثار و احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ محروم اہلِ حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام کرے۔ سلطان کے فرائض پر اظہارِ خیال کرنے والے متعدد مفکرین نے اس فرض کی صراحت کی ہے۔ جن مفکرین نے اسے فرائض امیر میں نہیں شمار کیا ہے مثلاً ماوردی اور ابو یعلیٰ ان کے پیش نظر غالباً یہ مفروضہ رہا ہے کہ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کی تحصیل و تقسیم سے یہ مقصد تمام و کمال حاصل ہو جائے گا۔

---

[۱] کنز العمال جلد ۲ [۲] ابو عبید کتاب الاموال صفحہ ۲۵۱ [۳] ایضاً صفحہ ۲۶۲

[۴] ایضاً صفحہ ۲۶۱ [۵] ابن عبدالحکیم: سیرۃ عمر بن عبدالعزیز بحوالہ مصطفیٰ السباعی: اشتراکیۃ الاسلام صفحہ ۳۵۱ [۶] ایضاً صفحہ ۳۵۲، نیز ابو عبید کتاب الاموال صفحہ ۲۵۱۔

[۷] ابن اثیر: الکامل جلد ۶ صفحہ ۲۲۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں:[1]

ویجب علی السلطان انہ متی وقعت رعیتہ فی ضائقۃ وصلوا فی شدۃ وفاقۃ ان یغیثھم لا سیما فی اوقات القحط وغلاء الاسعار حیث یعجزون عن التعیش ولا یقدرون علی الاکتساب فینبغی حینئذ للسلطان ان یغنیھم بالطعام ویعینھم من خزانتہ بالمال۔

سلطان پر یہ واجب ہے کہ جب اس کی رعایا کسی تنگی میں مبتلا ہو جائے اور فاقہ و مصیبت سے دوچار ہو تو ان کی مدد کرے، بالخصوص قحط اور گرانی کے زمانہ میں کیونکہ ایسے حالات میں لوگ کسبِ معاش میں ناکام رہتے ہیں اور کچھ نہیں پیدا کر سکتے ایسے حالات میں سلطان کو چاہیے کہ ان کو کھانا فراہم کرے اور ان کے خزانے سے انہیں مال دے کہ ان کی حالت بہتر بن جائے۔

ایک دوسرے مصنف نے لکھا ہے:

ولا یدع فقیراً فی ولایتہ الا اعطاہ ولا مدیوناً الا قضی عنہ دینہ ولا ضعیفاً الا اعانہ ولا مظلوماً الا نصرہ ولا ظالماً الا منعہ من الظلم ولا عاریاً الا کساہ کسوۃ[2]

امیر کو چاہیے کہ اپنی ولایت کی حدود میں بسنے والے ہر مفلس کو (مال) دے، ہر مقروض کا قرض ادا کرے، ہر کمزور کو سہارا دے، ہر مظلوم کی مدد کرے ہر ظالم کو ظلم سے روکے، اور ہر ننگے کو کپڑا پہنائے۔

ایک دوسرے محقق نے لکھا ہے۔

"واضح رہے کہ ہر انسان کے لیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تین چیزیں مع اپنے لوازم کے ناگزیر ہیں، ان کے بغیر اس کے لیے زندگی کا قیام اور اپنے پروردگار کی عبادت کی طرف یکسوئی کے ساتھ توجہ اور بقاءِ نسل ممکن نہیں، لہٰذا امام کے لیے ضروری ہے

۱؎ امام غزالی: التبر المسبوک بحوالہ پہلا صفحہ ۶۴ ۲؎ سید علی زادہ حنفی شرح "شرعۃ الاسلام" بحث فرائض امیر بحوالہ "اسلام کا اقتصادی نظام" مصنفہ مولانا حفظ الرحمٰن طبع ۱۹۴۶ صفحہ ۱۲۴ -

کہ ان تین چیزوں کو ہر فرد انسانی کے اس کے حالات اور صلاحیتوں کی مناسبت سے فراہم کرے، امیر و غریب، مرد و عورت، سب کے لیے۔ ان میں پہلی چیز کھانا اور پینا ہے کہ یہ اس کی زندگی کا ذریعہ ہے، اس کے بغیر اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ دوسری چیز کپڑا ہے خواہ وہ روئی کا ہو یا اون وغیرہ کا، اور تیسری چیز نکاح ہے، کیونکہ یہ بقاء نسل کا ذریعہ ہے[1]۔"

اس مسئلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل پورے اسلامی معاشرہ پر ایک فرض کفایہ ہے۔ اور فرض کفایہ کی بقدر کفایت تکمیل کی ذمہ داری بالآخر ریاست کے سر آتی ہے۔ یہ مقصد — ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل — جس حد تک افراد کے اپنے وسائل اور محنت، اور پھر معاشرہ کے رضاکارانہ تعاون سے نہ حاصل ہو سکے اس حد تک ریاست کو اپنے زیر اہتمام حاصل کرنا ہوگا تاکہ شریعت کا منشا پورا ہو جائے۔ بعض فقہاء نے اس اصولی بات کی صراحت بھی کر دی ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں[2]:

"فرض کفایہ میں شامل ہے . . . مسلمانوں کی تکالیف دور کرنا۔ مثلاً ننگے کو کپڑا پہنانا اور بھوکے کو کھانا کھلانا، جبکہ یہ ضروریات زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعہ نہ پوری ہو رہی ہوں . . ."

منہاج کے شارح رملی اس بیان پر سوال اٹھاتے ہیں کہ

"کیا 'تکلیف دور کرنے' (دفع ضرر) سے مراد اس مقدار کی فراہمی ہے جس سے سد رمق ہو جائے یا بقدر کفایت فراہمی مراد ہے"

اور اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ:

"اس بارے میں دو رائیں ہیں، جن میں صحیح رائے دوسری ہے (چنانچہ ایسا لباس فراہم کرنا ضروری ہے جس سے پورا بدن ڈھک سکے، اور جو جاڑے اور گرمی کے حالات کے لیے موزوں ہو نیز کھانے اور کپڑے کے ساتھ وہ چیزیں بھی شامل ہیں جو اتنی ہی ضروری ہوں، مثلاً طبیب کا معاوضہ، دوا کی قیمت، اور معذور کے لیے ملازم جیسا کہ ظاہر ہے[1]" (باقی صفحہ ۶۴)

---

[1] مختار الکونین بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام مصنفہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن طبع ۱۹۴۲ء ص ۱۵۲ تا ۱۵۴

[2] ابوذکریا یحییٰ بن شرف النووی: منہاج الطالبین طبع دار احیاء الکتب العربی۔ مصر ۱۳۴۲ھ ص ۱۲۵۔

رسائل و مسائل

پاکستان میں شرعی سزاؤں کے نفاذ کا مسئلہ

سوال :- پاکستان میں جماعتِ اسلامی کے مخالف حضرات پھر اُس مہم کو چلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں جو مارشل لا سے قبل اس کے چلانے میں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ یعنی یہ کہ آپ اور جماعت اسلامی کو بدنام کیا جائے۔ چنانچہ بعض خاص جرائد کے دیکھنے سے بخوبی واضح ہے۔ ان حضرات کی تقریروں میں بھی اس قسم کی باتیں عام اجتماعات اور اجلاسوں میں سُنی جاتی ہیں۔ اور منظر عام پر یہ باتیں آگئی ہیں۔

اس سلسلہ میں وہ سب سے زیادہ زور اس مسئلہ پر دیتے ہیں کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان میں حدود و قصاص اور شرعی سزاؤں کے نفاذ کو "ظلم" کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ قرآن کی تجویز کردہ سزائیں ہیں۔ حال ہی میں ایک ممتاز عالم ممبر قومی اسمبلی نے آپ کے متعلق اس قسم کا ایک بیان دیا ہے جو بعض جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جب ہم جرائم کے انسداد کی غرض سے شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لیے کوئی بل پیش کرتے ہیں تو الحاد پرست ممبروں کی طرف سے ہماری مخالفت اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ مولانا مودودی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ پاکستان کی مخلوط سوسائٹی میں حدود اور شرعی سزاؤں کا نفاذ ظلم ہے۔ اور مولانا کی تحریریں پڑھ کر ہمیں سنائی جاتی ہیں۔ یہ حضرات اسمبلیوں سے باہر آکر مجبوراً لوگوں سے کہا کرتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور حدود و قصاص، اور شرعی سزاؤں کے نفاذ کی راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ

وہی لوگ ڈالتے ہیں جو خود اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے بلند بانگ دعویٰ کرتے ہیں یعنی آپ اور جماعت اسلامی۔

اس قسم کی بحثیں اب عام و خاص کی مجلسوں میں شروع ہوئی ہیں۔ اور عام طور پر ان بحثوں اور مباحثوں کا اثر عوام، اور خواص دونوں پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ بلکہ وہ نئی نئی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں پڑ رہے ہیں۔ جس کے نتائج دُور رس اور اسلام اور عامۃ المسلمین کے حق میں خطرناک ثابت ہوں گے۔ اور جماعت کے کارکنوں کو بھی اس سے ہر جگہ مشکلات پیش آنے کا قوی اندیشہ ہے۔

اس سلسلہ میں آپ کا کوئی وضاحتی بیان یا کوئی ایسا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ جو پاکستان میں بحالتِ موجودہ شرعی سزاؤں کے نفاذ کے بارے میں آپ کے موقف کی وضاحت کے لیے کافی ہو۔"

جواب۔ آپ کی نصح و خیر خواہی کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ مگر آپ نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ یہ حضرات جو کھیل کھیل رہے ہیں اس کی تہ میں کیا ہے۔ شرعی سزاؤں کے متعلق میری ایک عبارت کو خاص معنی پہنا کر اچھالنے اور جگہ جگہ اس کو پھیلانے کی جو خدمت وہ انجام دے رہے ہیں، یہ کام کیا فی الواقع کسی ایسے شخص ہی کے کرنے کا تھا جو پاکستان میں حدودِ شرعیہ کے اجرا کا دل سے خواہاں ہو؟ اخلاص کے ساتھ اس بات کی خواہش رکھنے والا انسان تو یہ کوشش کریگا کہ اجرائے حدود کے معاملہ کو تمام اہل دین کے متفق علیہ مسئلے کی حیثیت سے پیش کرے۔ لیکن یہ حضرات ایک ایسے خادمِ دین کو جو برسوں سے اسلامی قانون کے نفاذ کی خاطر لڑ رہا ہے اجرائے حدود کے مخالف کی حیثیت دے رہے ہیں اور اس کا نام اچھال اچھال کر دنیا کے سامنے یہ یقین دلانے کے لیے پیش کر رہے ہیں کہ وہ پاکستان میں حدودِ شرعیہ کے نفاذ کو ظلم کہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عبارت کا یہ مفہوم مدعا میں نے بیان کیا تھا یا وہ اس میں یہ مفہوم داخل کر رہے ہیں؟ اس عبارت کی اشاعتِ عام میں کر رہا ہوں یا وہ کر رہے ہیں؟ اس کو اجرائے حدود کے معاملہ میں رکاوٹ ڈالنے کا ذریعہ میں بنا رہا ہوں

یا وہ بیمار ہے ہیں ؟ آج یہ لوگ نہایت مکاری کے ساتھ کہتے ہیں کہ "جب ہم شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لیے کوئی بل پیش کرتے ہیں تو الحاد پرست ممبروں کی طرف سے ہماری مخالفت اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ مودودی نے یہ اور یہ فتویٰ دیا ہے"۔ ان سے ذرا پوچھیے کہ مودودی کا یہ "فتویٰ" ان الحاد پرست ممبروں کے علم میں آپ لوگوں کے سوا اور کون لایا ہے ؟ آپ لوگ ہی تو ہیں جو مودودی سے انتقام لینے کے لیے اس کی ایک عبارت کو زبردستی شرعی سزاؤں کے خلاف فتویٰ بنا کر اچھال رہے تھے اور ہر روز اچھالے چلے جا رہے ہیں تاکہ کوئی الحاد پرست اس کو اپنی اغراض کے لیے ہتھیار بنائے۔

اور معاملہ صرف ایک عبارت ہی کا نہیں ہے۔ آئے دن میری کتابوں اور عبارتوں میں سے ایک نئی چیز نکالی جا رہی ہے اور ایک نیا الزام مجھ پر چسپاں کیا جا رہا ہے۔ میرے ساتھ ان لوگوں کا معاملہ وہی ہے جو اکابر دیوبند کے ساتھ بریلوی کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ لوگ خدا اور آخرت سے بالکل بے فکر ہیں۔ بلکہ ان کے اندازِ گفتگو میں دیانت تو درکنار شرافت تک کے آثار نہیں پائے جاتے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کی کسی بات کی طرف التفات نہ کروں گا اور صبر کے ساتھ اپنا کام کرتا رہوں گا۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

سوال ۔ تفہیمات کا مضمون (قطعِ ید اور دوسرے شرعی حدود) ایک عرصہ سے عنوانِ بحث بنا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں جناب مفتی . . . . . صاحب سے رجوع کیا گیا۔ انہوں نے مضمون مذکورہ کو غور سے مطالعہ کرنے کے بعد حکم دیا ہے کہ مندرجہ ذیل استفسار آنجناب سے کیا جائے :۔

۱ ۔ اسلام کے قانون و اصول قطعی طور پر ناقابلِ تجزیہ ہیں ؟ یا کچھ گنجائش ہے ؟ مثلاً اگر حکومت اجراءِ حدود کا قانون پاس کر دے اور جج حضرات ان قوانین کے عملی نفاذ کے مجاز ہو جائیں لیکن معاشرہ کی حالت یہی رہے جو اَب ہے اور اصلاح معاشرہ کے لیے کوئی قانون نافذ ہی نہ کیا جائے تو اس صورت میں شرعی ثبوت کے بعد رجم اور

جلد کی سزا ظلم ہوگی یا نہیں ؟

۲ - آپ نے تفہیمات میں لکھا ہے کہ نکاح، طلاق اور حجابِ شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاقِ صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے اِن حدود کا گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جا سکتا۔

حالانکہ مندرجۂ بالا صورت میں یہ ربط ٹوٹ جائے گا جو لوگ اس فعل کے ذمہ دار ہونگے (پارلیمنٹ یا حکومت) یقیناً ان کا یہ فعل نامناسب ہوگا۔ مگر کیا اِن قوانین کی رُو سے عدالت جو حکم اور حد جاری کرے گی کیا یہ حکم اور حد جاری کرنا ظلم ہوگا؟

۳ - کیا حکومت کو اصلاحِ معاشرہ کے لیے اجراءِ حدود کو کچھ مدت کے لیے ملتوی رکھنا چاہیے اور احکامِ اسلامی کے اجراء میں کسی خاص ترتیب کو ملحوظ رکھنا چاہیے ؟

جواب : میرے اُس مضمون کے متعلق سوال کرنے سے پہلے اچھا ہوتا کہ اسی مضمون کے آخر میں اس کی جو تاریخ تحریر درج کی گئی ہے اسے بھی دیکھ لیا جاتا۔ اور یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی کہ مضمون کا اصل موضوع زیرِ بحث کیا تھا۔ تفہیمات حصّہ دوم میں جہاں یہ مضمون درج ہے وہیں آخر میں یہ نوٹ بھی موجود ہے کہ یہ مارچ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت کوئی حکومت ایسی موجود نہیں تھی جس میں یہ سوال درپیش ہوتا کہ اب یہاں حدودِ شرعیہ جاری کی جائیں یا نہیں۔ پھر مضمون کا موضوع بھی یہ نہیں تھا کہ یہاں اجرائے حدود کی کیا صورت ہو۔ اس کا موضوع تو اُن لوگوں کے اعتراضات کا جواب دینا تھا جو زنا اور قذف اور سرقے کی شرعی سزاؤں کو انتہائی سخت قرار دیتے تھے اور وحشیانہ سزا کہنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ اس کے جواب میں ان کو سمجھایا گیا تھا کہ اسلام محض ان جرائم پر سزا ہی نہیں دیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ معاشرے میں اُن اسباب کی روک تھام بھی کرتا ہے جن کی وجہ سے لوگ ان جرائم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تم اسلام کی اس اصلاحی اسکیم کو نظر انداز کر کے معاشرہ تو وہ فرض کرتے ہو جس میں فسق و فجور کو بڑھانے کے لیے تمام اسباب فراہم کر دیے گئے ہیں، اور پھر یہ تصوّر کر کے چیخ اٹھتے ہو کہ اس صورتِ حال کو باقی رکھتے ہوئے

اسلام کا محض قانونِ تعزیرات نافذ کر دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں یہ سزائیں حد سے زیادہ سخت نظر آتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس بحث میں سے جن لوگوں نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ میں اجرائے حدودِ شرعیہ کا مخالف ہوں وہ کس حد تک نیک نیت ہیں اور ان کی نکتہ آفرینیاں کہاں تک قابلِ التفات ہیں؟

اب جو سوالات مفتی صاحب نے اس مضمون پر اٹھائے ہیں ان کا مختصر جواب حاضر ہے۔

اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومت اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دے دے، تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شاربِ خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دیگا وہ تو ظالم نہیں ہوگا، البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعتِ الٰہیہ کے ایک حصّے کو معطل اور دوسرے حصّے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایسی حکومت کو اُس آیتِ قرآنی کا مصداق سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ[1]۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ جو حکومت خود شراب بنانے اور بیچنے کے لائسنس دیتی ہو اور جس کی تقریبات میں خود حکومت کے کارفرما اور ان کے معزز مہمان شراب سے شغل کرتے ہوں اس کے قانون میں اگر شاربِ خمر کے لیے ۸۰ کوڑے لگانے کی سزا مقرر کر دی جائے تو ہم اسے اسلامی قانون نافذ کرنے والی حکومت کہنے میں حق بجانب ہونگے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ ایک طرف عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کو رواج دینا، لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ کالجوں

---

[1] کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور قیامت کے روز شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے۔

ہیں پڑھانا، عورتوں سے سرکاری دفاتر میں مردوں کے ساتھ کام لینا، ننگی تصویروں اور عریاں فلموں اور فحش لٹریچر کی بے روک ٹوک اشاعت جاری رکھنا، ۱۶ سال سے کم عمر کی لڑکی اور ۱۸ سال سے کم عمر کے لڑکے کا نکاح قانوناً ممنوع ٹھیرانا، اور دوسری طرف زنا پر رجم اور کوڑوں کی سزا دینا فی الواقع اسلامی قانون کا اجرا ہے۔ مجھے یہ ہرگز تسلیم نہیں ہے کہ سود اور قمار کو حلال کرنے والی اور ان محرمات کو خود رواج دینے والی حکومت چوری پر ہاتھ کاٹنے کا قانون نافذ کر کے اسلامی قانون نافذ کرنے والی حکومت قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی عالم دین اس متضاد طرز عمل کے جواز کے قائل ہوں اور ان کے نزدیک شریعت کے ٹکڑے کرنا اور اس کے اجزا میں سے بعض کو ترک اور بعض کو اخذ کر لینا ظلم نہیں بلکہ ایک نیکی ہو تو وہ اپنے دلائل ارشاد فرمائیں۔

دراصل یہ مسئلہ محض اس سادہ سے قانونی سوال پر بحث کر کے حل نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حالات میں شرعی حدود کا نفاذ جائز ہے یا نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے ہم کو محض احکام ہی نہیں دیے ہیں بلکہ ان کے ساتھ کوئی حکمت بھی سکھائی ہے جس سے کام لے کر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ایک مدتِ دراز تک کفر و فسق کی فرمانروائی کے تحت رہنے کے بعد ہمارے ملک میں جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ان میں اقامتِ دین کا کام اب کس طرح ہونا چاہیے۔ جہاں تک میں نے شریعت کو سمجھا ہے، اس کے نظام میں اصلاح، سدِ باب ذرائع، اور تعزیر کے درمیان ایک مکمل توازن قائم کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ ہر پہلو سے تزکیۂ اخلاق اور تطہیرِ نفوس کی تدابیر ہمیں بتاتی ہے، دوسری طرف وہ ایسی ہدایات ہمیں دیتی ہے جن پر عمل درآمد کر کے ہم بگاڑ کے اسباب کی روک تھام کر سکتے ہیں اور تیسری طرف وہ تعزیرات کا ایک قانون ہمیں دیتی ہے تاکہ تمام اصلاحی و انسدادی تدابیر کے باوجود اگر کہیں بگاڑ رونما ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا تدارک کر دیا جائے۔ شریعت کا منشا اس پوری اسکیم کو متوازن طریقے سے نافذ کر کے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے کسی جز کو ساقط اور کسی کو نافذ کرنا حکمتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواز میں یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ جس جز کو ہم نافذ کر رہے ہیں اس کے نفاذ کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ اس استدلال

کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکیم کا مرتب کردہ نسخہ کسی اناڑی کے ہاتھ آجائے اور وہ اس کے بہت سے اجزاء میں سے صرف دو چار اجزاء نکال کر کسی مریض کو استعمال کرائے اور اعتراض کرنے والے کا منہ بند کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرے کہ جو اجزاء میں استعمال کرا رہا ہوں وہ سب حکیم کے نسخے میں درج ہیں۔ اس کی اِس دلیل کا جواب آخر آپ بھی تو دینگے کہ بندۂ خدا، حکیم کے نسخے میں جو مُصلحات اور بدرقے درج تھے ان سب کو چھوڑ کر تو صرف سمیات مریض کو استعمال کرا رہا ہے اور نام حکیم کا لیتا ہے کہ میں اُس کے نسخے سے علاج کر رہا ہوں۔ حکیم نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرے نسخے میں سے جس جُز کو چاہے چھانٹ کر نکال لے اور جس مریض کو چاہے کھلا دے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شریعت آیا اپنے نفاذ کے لیے مومن و متقی کارکن چاہتی ہے یا فاسق و فاجر لوگ اور وہ لوگ جو اپنے ذہن میں اس کے احکام کی صحت کے معتقد تک نہیں ہیں؟ اس معاملے میں بھی محض جواز اور عدم جواز کی قانونی بحث مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ مجرد قانونی لحاظ سے ایک کام جائز بھی ہو تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکمتِ دین کے لحاظ سے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کیا حکمتِ دین کا یہ تقاضا ہے کہ احکامِ شرعیہ کا اِجراء ایسے حکام کے ذریعہ سے کرایا جائے جن کی اکثریت رشوت خور، بدکردار، اور خدا و آخرت سے بے خوف ہے اور جن میں ایک بڑی تعداد عقیدۃً مغربی قوانین کو برحق اور اسلامی قوانین کو غلط اور فرسودہ سمجھتی ہے؟ میرے نزدیک تو اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کر دینے اور خود مسلم عوام کو بھی اسلام سے مایوس کر دینے کے لیے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اِن لوگوں کے ہاتھوں احکامِ شریعت جاری کرائے جائیں۔ اگر چند بندگانِ خدا پر بھی جھوٹے مقدمے بنا کر سرقے اور زنا کی حد جاری کر دی گئی تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں حدودِ شرعیہ کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور دنیا میں یہ چیز اسلام کی ناکامی کا اشتہار بن جائے گی۔ اس لیے اگر ہم دین کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں، اس سے دشمنی نہیں کرنا چاہتے، تو ہمیں پہلے اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے جو دین کی سمجھ بھی رکھتے ہوں

اور اخلاص کے ساتھ اس کو نافذ کرنے کے خواہشمند بھی ہوں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ اسلام کی پوری اصلاحی اسکیم کو ہر جہت سے ہمہ گیر طریقے پر نافذ کیا جائے اور اسی سلسلے میں حدودِ شرعیہ کا اجراء بھی ہو۔ یہ کام بڑا صبر اور بڑی حکمت چاہتا ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں ہے کہ آج مجلسِ قانون ساز میں ایک دو نشستیں ہاتھ آگئیں اور کل حدود شرعیہ جاری کرنے کے لیے ایک مسودۂ قانون پیش کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سمجھ لینی چاہیے۔ ایک حالت تو وہ ہوتی ہے جس میں پہلے سے ملک کے اندر اسلامی قانون نافذ چلا آ رہا ہو اور بعد میں تدریجی انحطاط رونما ہوتے ہوتے یہ نوبت آگئی ہو کہ شریعت کے بعض حصے متروک ہو گئے ہوں اور جن حصوں پر عمل ہو بھی رہا ہو ان کو نافذ کرنے والے بدکردار لوگ ہوں۔ اس حالت میں حکمتِ دین کا تقاضا یہ نہ ہوگا کہ شریعت کے جو حصے نافذ ہیں ان کو بھی چھوڑ دیا جائے بلکہ یہ ہوگا کہ عام اصلاح کی کوششیں کرکے ایک طرف صالح عناصر کو برسرِ اقتدار لایا جائے اور دوسری طرف شریعت کے باقی ماندہ حصوں کو نافذ کیا جائے۔ دوسری حالت وہ ہے جس میں کفر و فسق کا سیلاب سب کچھ بہا لے گیا ہو اور اب ہم کو نئے سرے سے تعمیر کا آغاز کرنا ہو۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بنیادوں سے تعمیر شروع کرنی ہوگی نہ کہ اوپر کی منزلوں سے۔

خریدارانِ ترجمان القرآن

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں جو کہ ان کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ ورنہ عدم تعمیل کے لیے دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔

مینیجر

مطبوعات

مجموعہ رسائل | تالیف حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلوی - ترتیب و تصحیح : مولانا عبدالحمید صاحب سواتی - مقامِ اشاعت : مدرسہ نصرت العلوم نزد گھنٹہ گھر، گوجرانوالہ - قیمت ۲ روپے صفحات ۲۰۰ -

پاک و ہند کے جس گھرانے کے بارے میں وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" وہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان ہے۔ شاہ صاحبؒ کے چاروں فرزندان گرامی - حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ - اور شاہ عبدالغنیؒ نے دین کی نہایت پُر آشوب حالات میں خدمت سرانجام دی - آج لوگوں کے اندر دین کی جو تڑپ اور احساس موجود ہے وہ انہیں بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے - پھر یہ چاروں حضرات دین کے مختلف شعبوں میں خصوصی دسترس رکھتے تھے - شاہ عبدالعزیزؒ کو علومِ نقلی پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا - اور عقلی مسائل کو سلجھانے میں شاہ رفیع الدین کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی بصیرت عطا کر رکھی تھی

زیر نظر کتاب شاہ صاحب کے دس مشہور رسائل کا مجموعہ ہے یعنی رسالہ اذان، رسالہ فوائدِ نماز - رسالہ حملۃ العرش، رسالہ بیعت، رسالہ شرح رباعیات، رسالہ شرح چہل کاف، رسالہ شرح برہان العاشقین - رسالہ نذر و بزرگان، رسالہ جوابات سوالات اثنا عشر اور فتاوی) - یہ رسائل بڑے ادق ہیں اس لیے ان سے صرف علماء ہی استفادہ کر سکتے ہیں - عوام کے ہاتھوں میں ان کا دینا بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا ذریعہ ہوگا - فاضل مرتب نے اس کتاب کو بڑی محنت اور عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے اور مشکل مقامات پر حواشی لکھ کر بہت سی الجھنوں کو دور کر دیا ہے معیارِ کتابت وطباعت عمدہ ہے -

کلید ھدٰی بزبان انگریزی | تالیف : جناب طارق سفینہ پیرلیس - شائع کردہ : ادارہ ثقافت اسلامیہ
KEY TO THE DOOR

کلب روڈ، لاہور۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔ صفحات ۱۵۸۔

یہ کتاب ایک ایسے صاحبِ احساس اور صاحبِ شعور انسان کی داستانِ حیات ہے جسے حق کی تلاش میں روحانی کشمکش سے گزرنا پڑا اور بالآخر اُسے اسلام کے آغوش میں طمانیتِ قلب حاصل ہوئی۔ یہ صاحب ۱۸۸۶ء میں ایک اونچے مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اندر شروع ہی سے غور و فکر اور تلاش و جستجو کی گہری تڑپ موجود تھی۔ چنانچہ اُن کے ذہن میں اپنے عہد کے اقتصادی حالات اور مذہبی ماحول کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات اُبھرنے لگے۔ اپنے ملک کے اندر انہوں نے بڑے اضطراب کے ساتھ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے بعض نہایت ہی بھیانک منظر دیکھے۔ ان میں جس چیز نے اُن کی روح کو سب سے زیادہ مضطرب کیا وہ معابد میں امیر و غریب کی غیر انسانی تفریق تھی۔ پھر جب انہوں نے مذہبی مسائل کا مطالعہ شروع کیا تو انہیں حضرت عیسیٰ کی الوہیت، تثلیث، پیدائشی گنہگار ہونے اور کفارہ اور اسی طرح کے دوسرے تصورات نے پریشان کیا۔ اُن کے لیے اِن عقائد کی حیثیت ایک چیستان سے کم نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے تلاشِ حق میں عیسائیت کے مختلف فرقوں کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا لیکن ان کے قلب و دماغ کو کہیں بھی تسکین کا سامان فراہم نہ ہو سکا اور اس راہ میں ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ انہیں اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ عیسائیت ان کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دینے سے یکسر قاصر ہے۔ انہوں نے "لا ادری" کا مسلک اختیار کیا۔ اسی اثنا میں ان کی ملاقات ایک چینی مسلمان سے ہوئی۔ اُس نے اُن کے ذہنی اضطراب کو دیکھ کر قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ اور کچھ دوسری اسلامی کتب مطالعہ کے لیے انہیں دیں۔ طارق صاحب چونکہ ایک جہاز میں کپتان تھے اس لیے انہوں نے سمندر کی پُرسکون اور خاموش فضا میں کلامِ الٰہی پر غور و خوض کرنا شروع کیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کے سارے اضطرابات آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں اور اُن کی رُوح کو اطمینان اور سکون کی دولت میسر آ رہی ہے۔ انہوں نے اسلامی عقائد اور عبادات میں فطرت کی جھلک دیکھی اور اس بنیادی حقیقت سے آشنا ہوئے کہ یہاں ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو انفس و آفاق میں پوری طرح کارفرما ہے

تلاشِ حق کی یہ داستان بڑی دلچسپ اور فکر انگیز ہے اور اسے نہایت اچھے انداز میں قلمبند کیا گیا ہے کتاب کے ایک ایک لفظ سے حقیقت کا خلوص اور جذبۂ حق پسندی جھلکتا ہے اور اس نے اُن کی تحریر میں بے ساختہ پن پیدا کر دیا ہے۔

آغاز میں جسٹس شیخ عبد الرحمٰن کے قلم سے ایک قابلِ قدر مقدمہ بھی درج ہے۔

اہتمامِ جہاد | تالیف جناب محمد اکبر خان، ڈھوک شرقا، کیمبل پور۔ شائع کردہ: ملٹری پریس کیمبل پور۔ صفحات ۱۲۷۔ قیمت درج نہیں۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے مختصر سے سادہ انداز میں اسلام کے ارکانِ خمسہ نماز، روزہ، حج، قربانی کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کو صحیح انداز سے ادا کرنے سے انسان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ رضائے الٰہی کے لیے جد و جہد کر سکے۔ مصنف کے خلوص اور دلسوزی نے اُن کے بیان کو دلکش بنا دیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"آدمی کے باطن میں بھی ایک ایسی دنیا ہے جیسے اس کے باہر اس کا ماحول ہے۔ اس حق و باطل کی جنگ کی ابتدا درحقیقت آدمی کے باطن میں شروع ہوتی ہے۔ ایمان کھینچتا ہے تو کفر روکتا ہے۔ آدمی کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کی شیطان کی یہ ابتدائی کوشش ہے۔ اس کشمکش میں آدمی اگر شیطان سے مغلوب ہو کر اس کے زیرِ تسلط آجاتا ہے تو آدمی کی سب قوتیں شیاطین کے قبضہ میں آجاتی ہے۔ آدمی اسی طرح سوچتا ہے جیسے شیطان اس کی تعلیم و تربیت کرتا ہے" ص۳۱۔

کتابت و طباعت البتہ ناقص ہے اور پروف کے پڑھنے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا اس لیے بہت سی اغلاط دیکھنے میں آئیں۔ عربی عبارات میں تو غلطیوں کی بھرمار ہے۔

چراغِ راہ، آزادی نمبر | زیرِ ادارت: جناب خورشید احمد صاحب۔ جناب محمود فاروقی صاحب۔ ملک کا معروف ماہنامہ "چراغ نامہ" جس بے جگری کے ساتھ باطل افکار کے بگولوں

اور گمراہ کن تصورات کی آندھیوں کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس مجلہ نے بڑے نامساعد حالات میں بھی ہمت نہ ہاری اور اہلِ پاکستان کی اصل منزل یعنی اسلامی نظام کے قیام کی نہایت اچھے طریق سے نشان دہی کرتا رہا۔ اس معاملے میں نہ تو اپنوں کی سرد مہری اور نہ بیگانوں کا غیظ و غضب اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کر سکا۔ لیکن اسے اس ملک کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ سال حکومت نے ایک نہایت ہی اوچھا ہتھیار استعمال کر کے اس چراغ کو گل کر دیا۔ اس کے نتیجے میں فضا میں جو تاریکی پھیلی اُسے اس ملک کے ہر بہی خواہ نے بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ محسوس کیا۔

مقامِ شکر ہے کہ ایک سال کے جبری تعطل کے بعد یہ چراغ پھر روشن ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مساعی میں برکت دے۔ یہ شمارہ اس کا آزادی نمبر ہے۔ اس سے پیشتر یہ مجلہ اسلامی قانون نمبر اور نظریہ پاکستان نمبر شائع کر کے اس ملک کے ہر طبقہ سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ زیرِ تبصرہ نمبر بھی اپنے موضوع پر ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ اس کے مندرجات میں فکر و نظر کے تحت آزادی اور اس کے اسلامی تقاضے، نوعِ انسان کی آزادی اور اسلام، آزادی حضرت عمرؓ کی نگاہ میں، آزادی کا پہلا چارٹر، خاص طور پر بیش قیمت مقالات ہیں۔

تحریکِ آزادی کے تحت مسلمانوں کی جدوجہد آزادی - ۱۸۵۷ : ایک تاریخی جائزہ اور جماعت مجاہدین بڑے فکر انگیز مضامین ہیں۔

یہ پرچہ ہر اعتبار سے پذیرائی کا مستحق ہے۔

ترجمان القرآن کا "منصبِ رسالت نمبر"

جس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے منکرینِ حدیث کے اُن تمام دلائل کا منہ توڑ اور مسکت جواب دیا ہے۔ اس ضخیم نمبر کے دفتر میں چند پرچے باقی رہ گئے ہیں۔ ضرورت مند حضرات فوری توجہ فرمائیں۔ قیمت فی پرچہ تین روپے ۵۰ پیسے

دو سے زائد پرچوں کے خریدار کو ۲۵ فیصد رعایت — منیجر

(بقیہ اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں)

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ۱۸ھ کے شدید قحط کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے مدینہ میں سرکاری طور پر کھانا پکوا کر تمام ضرورتمند لوگوں کو کھلانے کا اہتمام کیا تھا اور اس انتظام کی نگرانی خود کرتے تھے۔ انہی دنوں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ

كان عمر بن الخطاب يطعم الناس بالمدينة وهو يطوف عليهم بيده عصا۔ فمر برجل يأكل بشماله فقال: يا عبد الله كل بيمينك: قال: يا عبد الله انها مشغولة قال فمضى ثم مر به وهو يأكل بشماله فقال يا عبد الله كل بيمينك قال يا عبد الله انها مشغولة۔ ثلاث مرات. قال: وما شغلها؟ قال: أصيبت يوم مؤتة قال فجلس عمر عنده يبكي، فجعل يقول له من يوضئك؟ من يغسل راسك وثيابك؟ من يصنع لذا وكذا؟ فدعا له بخادم وامر له براحلة وطعام وما يصلحه وما ينبغي له حتى رفع اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم اصواتهم يدعون الله لعمر مما رأوا من رقته بالرجل واهتمامه بامر المسلمين[2]

عمر بن الخطاب مدینہ میں لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے آپ ہاتھ میں ایک لاٹھی لیے اُن کے درمیان گشت کر رہے تھے۔ اسی دوران آپ کا گزر ایک ایسے آدمی کے پاس ہوا جو بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ آپ نے اس سے کہا: "بندۂ خدا، دائیں ہاتھ سے کھا" اُس نے جواب دیا، "بندۂ خدا، وہ ہاتھ مشغول ہے" آپ آگے بڑھ گئے۔ دوبارہ وہاں سے گزرے تو پھر دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے آپ نے اس سے پھر کہا، بندۂ خدا، دائیں ہاتھ سے کھا۔ اس نے کہا بندۂ خدا وہ ہاتھ مشغول ہے۔ اُس نے تین بار یہی جواب دیا۔ آپ نے پوچھا کس کام میں مشغول ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ ہاتھ موتہ کی لڑائی میں کام آیا۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سُن کر عمرؓ اُس کے پاس بیٹھ گئے اور رونے لگے اُس سے پوچھنے لگے کہ تم کو وضو کون کراتا ہے، تمہارا سر کون دھوتا ہے کپڑے کون دھوتا ہے، فلاں اور فلاں کام کون کرتا ہے؟ پھر آپ نے اس کے لیے ایک ملازم منگوایا اور اُسے ایک سواری دلوائی اور کھانا اور دوسرے سامانِ ضرورت دلوائے یہاں تک کہ اس آدمی کے ساتھ آپ کا سلوک اور مسلمانوں کی بہبود کے لیے عمرؓ کا اہتمام دیکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بلند آواز سے عمرؓ کے لیے اللہ سے دعائیں کرنے لگے۔

(باقی)

---

[1] شہاب الدین احمد الرملی: نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج جلد ۶ ص ۱۹۴ [2] امام محمد بن الحسن الشیبانی کتاب الآثار، حدیث نمبر ۸۵۲۔ ترجمہ اردو نشر کردہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی۔ ص ۲۱ - ۳۲۰۔

کیا امریکی صدارتی نظام ایک مثالی نظام ہے

کیا صدارتی نظام پارلیمانی نظام سے بہتر ہے

کیا صدارتی نظام جمہوریت کے لیے سازگار ہے

یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم سوالات کا جواب

نعیم صدیقی

کے قلم سے اُن کی تازہ تحقیقی پیشکش

امریکہ کا صدارتی نظام

میں مُلاحظہ فرمائیے!

امریکی صدارتی نظام کا بے لاگ تنقیدی جائزہ - اس کے حسن و قبح کا تفصیلی مطالعہ

—— اُردو میں اپنے موضوع پر پہلی معیاری کتاب ——

قانون اور سیاسیات کے طلباء اور ماہرین کے لیے خصوصی افادیت کی حامل

ضخامت ۱۴۴ صفحات —— قیمت دو روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳ ای

چند نئی مطبوعات

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

الجہاد فی الاسلام

[illegible] جہاد [illegible] حقیقت [illegible] [illegible] مدنی [illegible] [illegible] کے [illegible] پر [illegible]

پردہ

تمدنی زندگی میں عورت کا [illegible] کا اجتماعی زندگی پر اثر [illegible] اپنے موضوع پر ایک معرکۃ الآرا اور بے مثال کتاب [illegible] قیمت [illegible]

اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات

اسلامی نظام زندگی کی ضرورت [illegible] اس کے بنیادی تقاضے [illegible] اس کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی مطالعہ [illegible] دوسرے نظاموں سے اس کی برتری [illegible] [illegible] ایک انقلاب آفریں کتاب قیمت مجلد [illegible]

اسلامی ریاست

اسلام کے سیاسی نظریے [illegible] تشریح [illegible] ریاست کا ایک واضح تصور [illegible] اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب [illegible] دستور [illegible] ریاست کے لیے ایک گرانقدر [illegible] پاکستان [illegible] [illegible] قیمت [illegible]

تفہیمات

اسلامی مسائل پر [illegible] تحقیقی بحث [illegible] سیرت پر [illegible] تفصیل [illegible] قرآن [illegible] حدیث [illegible] ہدایات [illegible] نبوت محمدی کے اثبات [illegible] قیمت مجلد [illegible]

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۔ ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور